پرندے تو مسافر ہیں
(عبدالرحیم نشتر کی نظموں کا انتخاب)
محمد دانش غنی
اسباق پبلی کیشنز، پونے

پرندے تو مسافر ہیں

(عبدالرحیم نشترؔ کی نظموں کا انتخاب)

محمد دانش غنی

PARINDE TO MUSAFIR HAIN
(Abdul Raheem Nashtar Ki Nazmon Ka Intekhab)
Edit by
Prof. Mohd Danish Gani
Dept. of Urdu, Gogate Jogalekar College, Ratnagiri
Jannuary 2015
Rs.110/=
ISBN: 978-9380395-27-2

پرندے تو مسافر ہیں

(عبدالرحیم نشترؔ کی نظموں کا انتخاب)

محمد دانش غنی

ناشر

اسباق پبلی کیشنز

سائرہ منزل، 230/B/102، دمان درشن

سنجے پارک، لوہگاؤں روڈ، پونے-۰۳۲ ۴۱۱

(M) 9822516338 / 8055755623

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

کتاب کا نام	:	پرندے تو مسافر ہیں (عبدالرحیم نشتر کی نظموں کا انتخاب)
مرتب	:	محمد دانش غنی
صفحات	:	۱۹۲
سنِ اشاعت	:	جنوری ۲۰۱۵ء
تعداد	:	پانچ سو
سرورق	:	عبید حارث
قیمت	:	Rs. 110/-
زیرِ اہتمام	:	نذیر فتح پوری

...... ملنے کے پتے ......

☆ اسباق پبلی کیشنز، سنجے پارک، لوہگاؤں روڈ، پونے - 032 411

☆ شعبۂ اردو، گوگٹے جوگلے کر کالج، رتناگری - 612 415

☆ پلاٹ نمبر 7، ٹیچرس کالونی، جعفر نگر، ناگپور - 013 440

☆ 703 - دارالامان، پڑوے کر کالونی، ادھم نگر، رتناگری - 612 415

انتساب

اس
عید کے چاند
کے
نام
جو
عبدالرحیم نشتر صاحب
کے
گھر اترا تھا
لیکن
''موت پری''
اسے
اٹھا کر
لے گئی

مشمولات

عنوانات	صفحہ نمبر

شناس نامہ

ترتیب: محمد دانش غنی

عبدالرحیم نشتؔر

پیدائش ۲۶ رفروری ۱۹۴۷ء (کامٹی ضلع ناگپور، مہاراشٹر)

تعلیم : ایم اے (اردو، فارسی)، بی ایڈ،

پی ایچ ڈی (موضوع اردو ادب میں پیروڈی)

مطبوعات :

چہروں اور (ہندو پاک کی جدید غزلوں کا انتخاب) (ناشر) ۱۹۶۸ء

ارتکاز (ہندو پاک کی جدید غزلوں کا انتخاب) (مرتب) ۱۹۷۱ء

اعراف (شعری مجموعہ) ۱۹۷۲ء

بھوپال ایک خواب (افسانوی رپورتاژ) ۱۹۷۶ء

شامِ گراں (شعری مجموعہ) ۱۹۷۸ء

نورنژاد (ودربھ میں اردو افسانہ: پچاس سالہ دار کی تحقیق و تجزیہ) ۱۹۸۰ء

بیچارے فرشتے (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) ۱۹۹۴ء

کوکن میں اردو تعلیم ۱۹۹۷ء

کوکن رانی (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) ۱۹۹۷ء

کوکن میں اردو تعلیم (حصہ دوم) ۲۰۰۰ء

پونے میں اردو تعلیم ۲۰۰۴ء

موتی چور کے لڈو (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) ۲۰۰۵ء

گل چھرے (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) ۲۰۰۷ء

سارے موسم اس کے ہاتھ (شعری مجموعہ) ۲۰۱۳ء

صحافتی تجربہ

جولائی ۱۹۷۹ء میں کامٹی سے ایک ادبی جریدہ ''رقیب'' کے نام سے شروع کیا۔ اخبار کے ذریعے علاقائی سطح پر اردو زبان وادب کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی اخبار کے ذریعے آکاشوانی ناگپور سے اردو نشریات کی آواز بلند کی جس کے نتیجے میں ۲؍جون ۱۹۸۰ء سے ناگپور آکاشوانی سے ہفتہ وار اردو پروگرام کا آغاز ہوا۔ اسی طرح جون ۱۹۸۱ء میں وِدربھ نامہ کے نام سے ماہانہ کتابی سلسلہ شروع کیا۔ ناگپور یونیورسٹی میں اردو، شخص وشاعر، لب ولہجہ (ناگپور کی شعری روایت)، نکشف زار (آکولہ کی شعری روایت)، بیوزرینہ ثانی اور حسب منشا اس دور کی یادگار کتابیں ہیں۔ بعد میں ''ودربھ نامہ'' کو پندرہ روزہ اخبار بنا دیا گیا جس نے علاقۂ ودربھ میں علمی وادبی بیداری کا صور پھونکا اور نئی نسل کے متعدد ناموں کو آج کا معتبر فنکار بننے میں مدد کی۔

کالم نویسی :

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۲ء تک روزنامہ ''انقلاب'' ممبئی کے مقبول عام کالم ''خالی پیلی'' کے لئے ڈاکٹر جاہل ناگپوری کے نام سے طنزیہ مضامین لکھے۔ روزنامہ ''اردو ٹائمز'' ممبئی کے مشہور کالم ''ایسی ویسی'' کے لئے بھی متعدد طنزیہ مضامین لکھے۔ روزنامہ ''اردو سماچار'' ناگپور میں طنزیہ شاعری کا کالم چوگوشہ۔

ادبی سرگرمیاں و نشریات

مشاعرے، سمینار، سمپوزیم اور ادبی اجلاس۔ اب تک سینکڑوں ادبی، شعری اور تعلیمی تقریبات میں شرکت کر چکے ہیں۔ کامٹی کے ایک مشاعرے میں مولانا ناطق گلاوٹھی سے نئی شاعری کی حمایت میں جھڑپ کا برسوں چرچا رہا۔ عمیق حنفی اور فضیل جعفری سے ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد و ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی میں بحثیں چلیں۔ ۱۹۷۵ء سے اب تک پچاسوں بار ناگپور، ممبئی، پٹنہ، رتناگری، اور دہلی ریڈیو اسٹیشن سے غزل سرائی، نظم خوانی، تبصرہ، تذکرہ اور مضمون نویسی کے مواقع ملے۔ نئی دہلی دوردرشن نے ۱۹۷۴ء میں جدید اردو شعراء کا مشاعرہ ٹیلی کاسٹ کیا تھا۔ آپ اس مشاعرے کے شرکاء میں شامل تھے۔

انعام و اعزاز :

مختلف سماجی، تعلیمی اور ادبی اداروں کی ذریعے صوبائی وقومی سطح پر بے شمار اعزازات وانعامات

☆☆☆

عرضِ مرتب

اردو شاعری میں نظم نگاری کے جدید رجحانات کو فروغ دینے کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کے سر رہا ہے۔ان کی کوششوں سے سماجی و معاشراتی اور قومی موضوعات پر نظمیں لکھی گئیں ۔مغربی شاعری کی تقلید میں پابند نظموں کے ساتھ ساتھ آزاد نظمیں بھی لکھی گئیں ۔ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر نظم نگاری کے رجحان کو مزید فروغ ملا۔لیکن ترقی پسند تحریک اپنے نظریاتی بوجھ کے نیچے دب کر رہ گئی۔ وہ اس لئے کہ ادیبوں اور شاعروں کے ذہن کو نظریات کی زنجیروں سے جکڑنے کی کوشش کی گئی ۔اجتماعی جذبات واحساسات پر زیادہ زور دیا گیا اور شخصی طرزِ اظہار کی حوصلہ شکنی کی گئی۔شاعروں کو منشور اور رہنما اصولوں کی روشنی میں لکھنے کی تلقین کی گئی۔ظاہر ہے ضمیر و ذہن کی آزادی پر یقین رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لئے یہ پابندیاں ناقابلِ قبول تھیں ۔چنانچہ ردِ عمل کے طور پر جدیدیت کی تحریک ادبی منظر نامہ پر ابھری۔

۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت نے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔جدید شعراء نے اپنی شاعری کو اندرونی احساسات اور کوائف کا ترجمان بنایا اور اجتماعیت کے مقابلے میں انفرادیت پر زیادہ زور دینے لگے ۔انھوں نے علامت نگاری اور انوکھی تشبیہات واستعارات کے ذریعے اردو شاعری کو نیا رنگ وآہنگ دیا۔انہی جدید شعراء میں سے ایک اہم نام عبدالرحیم نشتر کا بھی ہے۔

عبدالرحیم نشتر ۲۶ رفروری ۱۹۴۷ء کو کامٹی ضلع ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالغنی (وفات ۱۰ دسمبر ۱۹۹۲ء) ایک محنتی، مستقل مزاج اور صابر انسان تھے۔ نشتر نے ۱۹۶۶ء میں ربانی ہائر سیکنڈری اسکول کامٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اردو میں پورے بورڈ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے۔ اس کے بعد ناگپور مہاودیالیہ میں داخلہ لیا۔ یہاں سے ۱۹۷۳ء میں بی اے اور ۱۹۷۶ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ ۱۹۷۵ء میں ریجنل کالج آف ایجوکیشن (بھوپال یونیورسٹی) سے بی ایڈ کیا۔ پی ایچ ڈی کی سند ۱۹۸۱ء میں ناگپور یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ''اردو ادب میں پیروڈی'' ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا۔ ۱۹۸۲ء میں ناگپور یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔

شاعری کی ابتداء ۱۹۶۰ء میں ہوئی جب عبدالرحیم نشتر ربانی ہائر سیکنڈری اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ تقریباً چار سو سے زیادہ غزلیں اور سو سے زائد نظمیں ان کا شعری اثاثہ ہے۔ رجحان فکر روایتی طرز سے جدا اور مثبت جدید افکار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ ان کا کلام ہندو پاک کے موقر رسائل وجرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

عبدالرحیم نشتر ہندوستان کی جدید اردو شاعری کا ایک نمایاں نام ہے۔ ان کا ادبی ورود ۱۹۶۲ء میں ہوا اور وہ ۱۹۷۲ء تک اپنی ادبی شناخت بنا چکے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے بعد سے تا حال اردو کے اہم ترین رسالوں اور اخباروں میں ان کا نام کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دیتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں دہائی کے نئے ادب میں وہ ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر خیال کئے جاتے ہیں لیکن ان کی نظموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر کے مختلف موقر ادبی جریدوں میں نشتر کی نظمیں پابندی سے شائع ہوتی ہیں جنہیں دلچسپی سے پڑھا بھی جاتا ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جتنی قدرت انھیں غزل پر ہے اتنی ہی نظم پر بھی ہے۔ نشتر نے پابند نظموں کے ساتھ ساتھ آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ جہاں تک موضوع کو برتنے کا تعلق ہے اسے بخوبی نبھایا ہے۔ موضوعات کے تنوع کے علاوہ الفاظ کے انتخاب اور ان کے مناسب استعمال پر بھی نشتر کو خاص قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کے مناسب دروبست سے وہ ایک قسم کی موسیقیت و غنائیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ خوبی

بہت کم شعراء کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان کا لب ولہجہ نوکیلا، خاردار اور درشت ہے۔ لفظیات کے سلسلے میں وہ آزادہ روی کے قائل ہیں۔ ہندی کے الفاظ اور محاورے بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ ذاتی تجربات واحساسات انتہائی تلخ اور کڑوے ہیں اور یہ تلخی اور کڑواہٹ ان کی نظموں میں بھی درآئی ہے۔

کسی شاعر کے نظریات کتنے ہی اچھے اور صحت مند کیوں نہ ہوں اگر انہیں بہترین شاعرانہ پیرایۂ اظہار میسر نہ ہو تو وہ کامیاب شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نظریات کو فن میں سمونے کا سلیقہ بڑی مشکل سے آتا ہے۔ عبدالرحیم نشتر ان گنے چنے شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی فن پر گرفت کافی مضبوط ہے اور وہ اپنے نظریات کے حقیقت پسندانہ اظہار سے اپنی تخلیقات کی فنی حیثیت متاثر نہیں ہونے دیتے۔ نشتر نے اپنی نظموں کو موثر بنانے کے لئے علامات نگاری اور انوکھی تشبیہات واستعارات کے لطیف شاعرانہ استعمال کا سہارا لیا ہے۔ انہوں نے الفاظ وتراکیب اور تشبیہات واستعارات کے استعمال میں ندرت وشگفتگی کا خاص خیال رکھا ہے اور ہندی زبان کے وہ کومل الفاظ استعمال کیئے جو نظم کے موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ ان کے یہاں شب باراں، دزدیدہ نگاہی، شکستہ منظری کے رخ، سیاہ پردوں کے کاروں، دودھیا بادل، مشین کی چیخ، غبارِنور، فرشتے دودھیا ملبوس پہنے، سفید سور، سنہرا فصل، محبت کا سفر، کوچۂ قاتل، اینٹ مٹی کی فرسودگی، عذابی دھوپ، میٹھی کٹاری، دیوی، آتش حسن، مکھڑا سرور کا، عروسِ اجل، نٹ کھٹ ابر کے ٹکڑے وغیرہ جیسے الفاظ وتراکیب اور تشبیہات واستعارات بھی ملتے ہیں۔

نشتر کی بعض نظمیں طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہیں۔ یہ نظمیں نشتر نے اپنے گرد وپیش میں پائے جانے والے عدم توازن، ستم ظریفی حالات یا زندگی کی حقیقتوں کی بے حرمتی کے ردعمل کے طور پر کہی ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں "چوہے بلی کی کہانی"، "تعصب"، "میٹھی کٹاری"، "سفید سور" اور "مجھے تو قتل ہونا ہے" اپنی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں طنز کا بڑا تیکھا وار ہے۔ ہر مصرعہ اثر اور شعریت سے بھرپور ہے۔ زبان وبیان کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی یہ نظمیں کامیاب ہیں۔ ربط وتسلسل کے ساتھ ساتھ مرکزی خیال میں بھی

ارتقاء نظر آتا ہے۔ ان کی نظم "چارہ ساز" دیکھئے۔

چٹورے، مفت خورے
سب پجاری رقص کرتے ہیں
نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں
وہ دیوی ہے کہ ڈائن ہے
نہیں کھلتا یہ راز اب تک
سمجھ رکھا ہے بچاروں نے اس کو
چارہ ساز اب بھی!

دراصل جب ان کا سامنا زندگی کی غلاظتوں سے ہوتا ہے تو وہ ان سے کس طرح منھ موڑ سکتے ہیں۔ یہ غلاظتیں ان کے مزاج میں برہمی پیدا کرتی ہیں اور وہ تلخی، جھنجھلاہٹ اور جھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سماج کی ناہمواریاں بھی انھیں طنز کا سہارا لینے پر بھی مجبور کرتی ہیں۔

نشتر کی شاعری کی ایک خصوصیت جو ہمیں خاص طور پر متاثر کرتی ہے وہ ان کی منظر نگاری ہے۔ نشتر فطرت کے پرستار ہیں۔ وہ فطرت کے بکھرے ہوئے حسن کو اپنی آنکھوں کے راستے سے اپنی روح میں جذب کر لیتے ہیں پھر وہ اپنی شاعری کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کو بھی حسنِ فطرت سے لطف اندوز ہونے میں شریک کرتے ہیں۔ نشتر نے فطرت کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا اور انہیں برتا۔ ان کی منظر نگاری میں ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ وہ بھی نظیر اکبرآبادی کی طرح ہندوستانی مناظر ہی کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ شاعرانہ تخیل کی بجائے انہی مناظر کی مصوری کرتے ہیں جنہیں صبح و شام ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "دودھیا بادلوں کی سواری" کا یہ اقتباس دیکھئے جس سے پورا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

سبز و شاداب پیڑوں پہ ہنستی ہوئیں
نرم و نازک ہری پتیاں جھوم اٹھیں

ننھے منے پرندوں کی چہکار سے
منظروں پہ نئے رنگ پڑنے لگے
ہر طرف سبز و شاداب پھلواریاں
موسم رنگ و بو کی فسوں کاریاں
آسماں سے فرشتے اترتے ہوئے
میری دھرتی کو پرنور کرتے ہوئے
مخملیں سبز پوشاک پہنے ہوئے
سرمئی کوہساروں کی آغوش سے
صاف و شفاف جھرنوں سے بہتے ہوئے
موج در موج نیچے اترتے ہوئے

عموماً نشتر کے یہاں فکر و فن میں ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ ان کی حقیقت پسندی رومانوی عناصر سے ہم آہنگ ہو کر نظموں میں اکتاہٹ کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتی۔ خشک سے خشک موضوعات کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان میں ایک رنگینی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں نشتر کے فنکارانہ احساس کا بڑا دخل ہے۔ نظم ''اسیرِ جنگ'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

ڈوبتی ابھرتی شام
روز روز مرتی شام
اور سب کی ہونٹوں پر میرا انوکھا اک نام
تم تمہاری آنکھوں میں
ڈوبتے ہوئے سائے
جیسے شام ہوتے ہی کالی رات آجائے
ایک وسوسہ بن کر ذہن میں سما جائے
کب رہا ہوگا میں
اور کب مرے بچے میرا پیار پائیں گے

کب تمہارے سینے کا ارتعاش کم ہوگا

عبدالرحیم نشتر کی شاعری میں اگر کہیں غم وافسردگی کا سایہ نظر آتا ہے تو اس کا تعلق ان کی نجی زندگی کے المیے کے بجائے پوری نسل کے المیے سے ہے۔ ان کی یہ ناقابلِ شکست رجائیت اس سیاسی وسماجی شعور کی دین ہے جس کے اثرات اس زمانے میں رونما ہو رہے ہیں۔ نشتر کی یہ سیاسی بصیرت اور سماجی شعور ان کی نظموں میں زیادہ واضح طور پر نظر آتا ہے جہاں وہ سماج سے اپنی بے اطمینانی و ناآسودگی پر احتجاج کرتے ہیں۔ عبدالرحیم نشتر کے یہاں فنی بے راہ روی نہیں ملتی۔ وہ پرانی روایتوں سے انحراف نہیں کرتے۔ ان کے یہاں کلاسیکی شعرا جیسی باوقار سادگی و پرکاری اور نغمگی اور غنائیت ہے جو ان کی نظموں میں نعرہ بازی کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتی۔ وہ اپنی تخلیقات میں نزاکت اور حسن کاری کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور اپنے نکھرے ہوئے شعور کی مدد سے وسیع معنویت کی حامل تشبیہات اور تراکیب تراش کر اپنی تخلیقات کو سحر آفرینی اور معنویت عطا کرتے ہیں جو ان کے ہمعصروں کے یہاں کم کم ہی ملتی ہے۔

تمثیل نگاری عبدالرحیم نشتر کی شاعری کا ایک خاص پہلو ہے۔ نصیحت وموعظت کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ بلا واسطہ اور بالواسطہ یعنی براہِ راست کوئی بات نہ کہہ کر استعارے کے پردے میں کہی جائے تاکہ زود اثر ہو۔ آہستہ آہستہ اس طریقے نے تمثیل کی شکل اختیار کرلی۔ ابتداء میں اس کا مقصد خام ذہنوں کی علمی اور اخلاقی تربیت تھی لیکن بعد میں شعراء نے اس سے خوب کام لیا اور یہ شاعری کی زینت بن گئی۔ نشتر کی بیشتر نظمیں معنی خیز اور فکر انگیز تمثیلیں ہیں۔ ان کی ایک نظم ''سفید سور'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

صفِ سگاں کچھ بگاڑ پائی
نہ اڑتے کوؤں کی کائیں کائیں
یہ موٹے موٹے سفید سوّر
نگاہ رکھتے ہیں دائیں بائیں
کہ تیز دانتوں سے ناخنوں سے

کسی بھی حیواں کو پھاڑ کھائیں
شریر کتے، غصیلے کوے کبھی ہراساں
کبھی ہراساں، کبھی پریشاں
کبھی تماشائی بن گئے ہیں

اس کے علاوہ بھی بہت سی نظمیں ہیں، جو تمثیل کی عمدہ مثالیں ہیں۔

عبدالرحیم نشتر دورِ جدید کے شاعر ہیں اسی لئے ان کی شاعری زندگی کی شاعری ہے جو آج کے سلگتے ہوئے آتش فشاں مسائل کی ترجمانی کرتی ہے۔ نشتر کا اسلوبِ اظہار اور اسلوبِ خیال دونوں رچے اور نکھرے ہوئے ہیں۔ ان کا لہجہ تند و توانا اور بیباک ہے۔ منفرد الفاظ اور تراکیب کے استعمال نے ان کی نظموں کے اندر اور بھی توانائی اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ معانی و مفہوم میں بھی بڑی وسعت ہے۔ ضرورت، یہ چھیڑ کرتی ہوا، آسماں پر چمکتی ہوئی کہکشاں، عروسِ اجل، اسیرِ جنگ، شعلہ زخم، تتلی، نئی پرواز، موت، کہاں گئے ہو غازیو، دودھیا بادلوں کی سواری، مسافر چل رہا ہے، نواحِ یار میں، نئے منظر چمکتے ہیں، صناعِ اجل کا انعام، اس برس کی عید وغیرہ نہایت خوبصورت اور شاندار نظمیں ہیں جن کا موضوعاتی تنوع انہیں منفرد لہجہ کا نظم نگار کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔

لیکن اردو تنقید نے عبدالرحیم نشتر جیسے منفرد شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کیا جس نے مدتوں شعر و ادب کی خدمت کی اور نہ جانے کتنے ہی ذہنوں کی آبیاری کی۔ میں نے نہایت سنجیدگی، محنت اور احتیاط سے عبدالرحیم نشتر کی نظموں کا انتخاب "پرندے تو مسافر ہیں" کے عنوان سے اس لئے کیا ہے کہ آئندہ لوگ نشتر کی شاعری اور فن کی جانب متوجہ ہوں اور ان کی رفعت و عظمت کا زیادہ بہتر طور پر اور کھل کر اعتراف کریں۔ اگر ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا کہ میری آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔

میں عبدالرحیم نشتر کی شاعری اور فن پر اظہارِ خیال کرنے والے ممتاز و مقتدر اہلِ قلم محترم خلیل مامون صاحب، محترم ف۔س۔ اعجاز صاحب، محترم نسیم صبا نویدی صاحب، محترم ڈاکٹر محسن جلگانوی صاحب، محترم سید یحییٰ نشیط صاحب، محترم عبدالاحد ساز صاحب اور محترم

نذیر فتح پوری صاحب کی محبتوں اور نوازشات کا بے حد ممنون ہوں۔ برادرم مجید حارث کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے بڑی لگن کے ساتھ خوبصورت اور معنی خیز سرورق تیار کیا۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہو رہی ہے میں کونسل کا بھی شکرگزار ہوں۔

سخت ناانصافی ہوگی اگر میں اپنی شریک حیات زرینہ ترنم، بیٹی مفلحہ فاطمہ اور بیٹا محمد عانی کا شکریہ ادا نہ کروں جن کو میرے ادبی کام کی وجہ سے بہت سی محرومیوں اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی وہ میرے گھر کو گوشۂ عافیت بنائے ہوئے ہیں۔

محمد دانش غنی

۹ر ستمبر ۲۰۱۴ء

پیش لفظ

شاعری چاہے قدیم ہو یا جدید اس کی کوئی طے شدہ تعریف ممکن نہیں ہے۔ ہر عہد، ہر زمانے اور ہر جغرافیائی خطے میں شاعری کی تعریف الگ ملے گی۔ اب تک شاعری کی تحسین و تعریف کے لئے جو تصورات اور توضیحات وضع کئے گئے ہیں ان کی نوعیت اس فن کو اس کی روایات کے مخصوص پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے کئے گئے ہیں۔ شاعری کی ہر صنف کے تقاضے الگ ہیں اس لئے ہم غزل کے اشعار کی الگ پیمانوں پر تشریح کرتے ہیں اور مثنوی، قصیدہ، دوہا اور رباعی کی الگ پیمانوں پر اور جب دوسری زبانوں کی صنفوں مثلاً ثانیٹ، ہائیکو یا ترائیلوں کی بات ہو تو پیمانوں کی نوعیت بالکل الگ طرز کی ہو جاتی ہے۔ اس پس منظر میں آزاد نظم نگاری کی بنیاد ہی الگ ہے۔ آزاد نظم کی تخلیق میں نہ صرف یہ کہ آپ ردیف و قوافی کی پابندیوں سے آزاد ہیں بلکہ بحور و اوزان کی پابندیوں سے بھی۔ لیکن بحور و اوزان کی پابندیوں سے آزاد نظم آج بھی کلیتاً آزاد نہیں ہے کیونکہ ابھی انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہمارے اکثر شعرا غزل کی روایت کے زیرِ اثر ہوتے ہوئے اپنی تخلیقی توانائیوں کو بحور و اوزان سے آزدی کے میدان میں داخل نہیں کر سکے ہیں۔ ان شعراء کا اظہار ابھی تک بحور و اوزان کے طابع ہونے کی وجہ سے صحیح معنوں میں کلیتاً آزاد نظمیں خلق کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ میری مراد یہاں ایسے اظہار سے ہے کہ جس میں غزل کے مشتمل بحور شامل نہ ہوں۔ لیکن نئی نظم کو ایک نہ ایک دن تو ایسے اظہار سے آزاد ہونا ہی ہے۔

اس امر کے باوجود کہ نئی نظم بحور و اوزان کے شکنجے سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئی ہے۔ ردیف و قافیہ سے آزاد مگر بحور و اوزان میں بند نئی نظم نے ہماری شاعری کو متنوع موضوعات، احساسات اور جذبات سے مالامال کیا ہے کہ جو ہماری غزل میں مفقود ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہماری نئی نظم شاعری کو ایسی انفرادیت بخشتی ہے جس کی روح سے اکثر جدید نظم گو شعرا کی نظمیں اپنے اسلوب، اظہار اور موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔

نئی نظم قوسِ قزح کی طرح ہے کہ جس میں ہر رنگ دیکھ جا سکتا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جو غزل میں نہیں ملتی۔

میراجی، راشد اور اختر الایمان کے علاوہ ان کے فوری بعد آنے والے نظم نگار شاعروں کے یہاں اسلوب و مواد کا تنوع بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے جدید عہد میں ہمیں موضوع اور کسی حد تک ہیئت میں تنوع رکھنے والی بے شمار نظمیں مل جائیں گی۔ آپ کسی بھی نظم کو پڑھنے اور سننے کے بعد یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ فلاح شاعر کی نظم ہے۔ نظم کا یہ پہلو شاعری کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ آزاد نظم میں شاعر کی آزادیِ اظہار کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔ یہ بات نئی غزل کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔

عبدالرحیم نشتر کی نظموں کو سمجھنے کے لئے مندرجہ بالا باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

عبدالرحیم نشتر تقریباً پانچ دہائیوں سے کچھ زیادہ عرصے سے شاعری کر رہے ہیں لیکن ''پرندے تو مسافر ہیں'' جو ان کی اب تک لکھی گئی نظموں کا انتخاب ہے پہلی بار منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کی غزلوں کے تین مجموعے ''اعراف (۱۹۷۲ء)''، ''شامِ گراں (۱۹۷۸ء)'' اور ''سارے موسم اس کے ہاتھ (۲۰۱۳ء)'' شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں پابند اور آزاد دونوں طرح کی نظمیں شامل ہیں۔ عبدالرحیم نشتر کی پابند نظموں میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھی گئیں نظموں کا سا تاثر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ''عروسِ اجل''، ''نیا سال...... پرانے زخم'' اور ''روزی اور موت'' اچھی

نظمیں ہیں اور قاری پر اپنا گہرا اثر ڈالتی ہیں۔

عبدالرحیم نشتر کی اکثر نظموں کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ اردو میں غالباً پہلی بار ایک ایسا شعری اظہار سامنے آیا ہے جسے ہم بہ آسانی مغرب کے سرریلزم (SUREALLISM) سے ہمکنار پاتے ہیں کہ جہاں فن میں حقیقی اور غیر حقیقی کا امتزاج ہوتا ہے۔ عبدالرحیم نشتر کی نظمیں محض ایسے ترسیل وابلاغ کا وسیلہ نہیں کہ جہاں کسی حقیقی واقعہ، جذبہ یا تصور کا اظہار کیا گیا ہو بلکہ ان کی نظمیں ایسا کلی پیکر ہے جو کوئی بات کہنے کے علاوہ بھی ایسا غیر راست تاثر پیدا کرتی ہیں جو موضوع سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتا اور نظم کو انوکھے حسن سے مالا مال کرتا ہے۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس تاثر میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ان کی کئی نظموں میں تو نظم کا معروض محض تصوری اور لسانی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی نظمیں محض ترسیل کا ذریعہ نہ ہوتے ہوئے جمالیاتی لسانی تشکیل کے حسن کا مظہر ہے۔ یہ بات جدید اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ اس فنی پہلو کے باوجود عبدالرحیم نشتر کی نظمیں بہت سیدھی سادی ہیں۔

اس قبیل کی نظموں میں ''شعلۂ زخم''، ''ہواؤں کا ہجوم''، ''آسمان پر چمکتی ہوئی کہکشاں''، ''دوسرا آدمی''، ''شناخت''، ''مہرباں رات مری ماں جیسی''، ''تو میں نے دیکھا''، ''دودھیا بادلوں کی سواری''، ''وہ آرہی ہے''، ''سزا''، ''نئے منظر چمکتے ہیں''، ''صناعِ ازل کا انعام'' اور ''خوشبو کا جھونکا'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

عبدالرحیم نشتر کی نظموں کا ایک اور وصف ان میں گیتوں کا سا آہنگ اور موسیقیت ہے۔ ان کا بیانیہ اتنا رواں ہے کہ قاری بغیر کسی مصرعہ پر رکے پوری نظم پڑھ جاتا ہے۔ عبدالرحیم نشتر کے یہاں بلا کی موزونیت ہے۔ ان کی آزاد نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم کوئی آزاد نظم پڑھ رہے ہیں۔ اس عہد کے اکثر نئے شعرا کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر محض کسی بحر پر سوار بھاگا چلا جا رہا ہے لیکن نشتر کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ان کی نظموں میں بحر پر موضوع اور اظہار کی گرفت بہت سخت اور بجلی ہے۔ ان کے یہاں عجزِ اظہار کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کی اکثر نظمیں ایک کل کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

مجموعی طور پر اس مجموعے میں شامل نظمیں جو بظاہر سیدھی سادی نظر آتی ہیں شعری فن

کے ایسے عناصر کا اظہار کرتی ہیں جو اردو کی جدید نظموں میں نظر نہیں آتے۔

گذشتہ پچیس برسوں کے عرصے میں خلق کردہ ان نظموں کا انتخاب کرنا اور پھر انہیں ترتیب دینا ایک بڑا کام ہے۔ محمد دانش غنی نے اس کام کو بڑی کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔ اس پر وہ ہماری دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین، ادب نواز حضرات اور ہمارے نقادوں میں اس مجموعے کی صحیح پذیرائی ہوگی۔

خلیل مامون

۱۶؍نومبر ۲۰۲۳ء

نمکین اسلوب اور میٹھے لہجے کا شاعر

ف۔س۔اعجاز

عبدالرحیم نشتر کو میں ایک نظم گو شاعر کے طور پر شناخت کرتا ہوں۔ جب ایک ساتھ ان کی بہت ساری نظمیں دیکھیں تو پتہ چلا کہ پانچ دہائیوں کی ریاضت نے انہیں بڑا تخلیقی اثاثہ سونپ دیا ہے جو اگر ان کے لئے قابلِ فخر ہے تو سخن فہموں کے لئے بھی مایۂ ناز ہے۔ ان کی نظموں میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے براہِ راست سیاسی موضوعات کو تو کم چھوا ہے لیکن ان موضوعات سے زیادہ دور بھی نہیں رہے۔ چنانچہ ''کہاں گئے ہو غازیو!''، ''موت''، ''نئی پرواز''، ''سفید سور''، ''مجھے تو قتل ہونا ہے'' اور ''انٹرویو'' جیسی نظموں میں ایک فاصلے سے سیاسی مصلحتوں اور سماجی سرد کاروں کو اپنے شعری حصار میں لے لیا ہے۔ ''نئے منظر چمکتے ہیں'' کی اساس بھی وہی فکر ہے جو فنکاروں کو اہلِ زمین کے درد میں شرکت پر مجبور کرتی ہے۔

انسانی مسائل کی تفہیم میں عبدالرحیم نشتر کی اولین پیش قدمی سیاسی کے بجائے انسانی تحریک کی بناء پر ہوتی ہے۔ ان نظموں میں شعر کا اظہار داخل سے خارج کی طرف ہوا ہے۔ ''اسیرِ جنگ'' میں اظہار کی سمت برعکس ہے یعنی خارج سے باطن کی جانب ہے۔ دونوں صورتوں میں ان کی نظمیں تاثر سے عاری نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نئی نظموں کا اثر دیرپا ثابت ہوا ہے۔

عبدالرحیم نشتر کی دوسری قسم کی نظمیں زیادہ تر تہہ دار ہیں اور زیادہ تخلیقی وفور کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ حیات اور روحِ کائنات دونوں سے بہت قربت رکھنے کے نتیجے میں تجربوں اور

مشاہدوں کو بکثرت سمیٹ لیتی ہیں۔ ''وہ آرہی ہے''، ''نئی پرواز''، ''جاگیر''، ''تعصب''، ''چارہ ساز'' وغیرہ نظموں میں شاعر کا تخلیقی عمل بہ یک وقت ذاتی اور سماجی انتشار کی دین ہے۔ ''خدا واپس نہ آئے گا''، ''مجبوری''، ''ایک پریشان شام آزادی'' میں تہذیب وثقافت کی پامالی کو شاعر نے مختلف استعاروں میں ڈھال لیا ہے۔ جہاں تک حسن وعشق کی وارداتوں کا تعلق ہے نشتر صاحب نے انہیں جذبہ وفکر کی ہم آہنگی کے ساتھ نظم بند کر کے واقعی کمال کیا ہے۔ ''ادھورا وسیلہ''، ''کہیں ایسا نہ ہو''، ''شامِ گراں''، ''واپسی''، ''دنوں بعد''، ''تتلی''، ''ذرا سی بدگمانی''، ''یہ چھیڑ کرتی ہوا''، ''دوسرا آدمی''، ''شناخت'' ایسی نظمیں ہیں جن میں کہیں ابھری جذباتیت اور روایت نظر نہیں آتی جب کہ یہ معاملات حسن وعشق کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ ان کے تلازمات کچھ نئے سے ہیں اور نئے شعری عرفان کی خبر دیتے ہیں۔ ان تخلیقات میں گہری گمبھیر باتیں ہیں۔ عاشق کی خاص دلچسپیاں اور شاعر کی من موہک شوخیاں ہیں جو کہیں کہیں نئی چھیڑ چھاڑ سے آباد و آراستہ دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ ''اللہ جو یوں کروں تو'' جیسی مختصر نظموں میں محبت آپ زندگی کا بھرپور استعارہ بن گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے

اک اجنبی مکاں میں
بیٹھا ہوا ادب سے
ابو سے گفتگو میں
کھویا ہوا ہوں کب سے
اتنا نہیں کہ آنکھیں
دیوار و در کو تاکیں
دہلیز کو پھلانگیں
پردے کے پیچھے جھانکیں
دیوار سے لگی میں
کب تک کھڑی رہوں گی
دروازے کو ہلاؤں

یا چوڑیاں بجاؤں
امی ہنسیں گی مجھ پر
ابو خفا رہیں گے
اللہ! جو یوں کروں تو
وہ خود بھی کیا کہیں گے

عبدالرحیم نشترؔ کی غیر رسمی نوعیت کی آزاد نظموں میں پھولوں کے مہکتے نم الاؤ ہیں تو خراشیں چھوڑ جانے والے نوکدار کانٹے بھی۔ اندرونی طور پر ان نظموں کی آبیاری شاعر کے خون کی حدت سے ہوئی ہے۔ اسی لئے ان کی شاخوں پر کہیں کہیں ننھی ننھی لہو کی بوندیں بھی نظر آتی ہیں جو شاعر کے اپنے نمکین اسلوب اور میٹھے لہجے کی پہچان بن گئی ہیں۔ یقیناً عبدالرحیم نشترؔ کا خون بے کار نہیں بہا۔ اپنی باتیں انہوں نے اپنی رمز میں کہہ دی ہیں۔ تخلیقی عمل سے اور کیا چاہیے؟؟؟

(۲۶/ جولائی ۲۰۰۸ء)

☆☆☆

عبدالرحیم نشتر اور نئی نظم کا سفر

علیم صبانویدی

بیسویں صدی کا آغاز اردو نظم نگاری میں ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس نے اردو نظم کو ایک نئی کروٹ دی اور نئی آواز سے روشناس کرایا۔ جس سے شعری دامن وسیع ہوا۔ موضوعات میں سماجی تغیرات کی علامت جاگی۔ قومی مسائل کو اولیت ملی۔ ملکی و غیر ملکی مسائل کا ذکر شروع ہوا۔ ادب کے خدوخال میں نمایاں تبدیلی آئی۔ نئے رنگ و آہنگ اور نئے اسلوب کی بازیافت عمل میں آئی۔ فکری اور حکیمانہ پہلوؤں کے ساتھ مارکسی نظریہ کی بھی چمک پیدا ہوئی۔ فیض، مجاز، مخدوم، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، سلیمان اریب، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی وغیرہ نے اپنے اپنے حدود میں زندگی اور زندگی کے مسائل کی ترجمانی کی۔ لیکن اسی مارکسی فکر کے بیچ بیچ ایک دوسری رو بھی موجود تھی جسے بال و پر دینے میں ن م راشد اور میراجی کا شاعرانہ مسلک معاون ثابت ہوا اور رفتہ رفتہ ایک نئے فکری میلان کی بازیافت کا عمل شروع ہوا۔ اس نئے رجحان کو نئی نظم کے شعراء نے استحکام بخشا۔ عبدالرحیم نشتر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

عبدالرحیم نشتر کی نظموں کے مضامین فکری بالیدگی اور مطالعے کی تازگی کے باعث طے پائے ہیں۔ ان کی نظموں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عروضی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ ارکان مساوی نہ ہوں تو ان میں اکائیوں کے طور پر عروض کی پابندی کو بحال رکھا گیا ہے نیز ان کے تسلسل میں کہیں انقطاع پیدا نہیں ہوتا۔ وہ آغاز و انجام سے

مابین موضوع کی توسیع کو بڑے اہتمام سے آگے کی طرف بڑھاتے ہیں۔ پوری نظم نہ پڑھتے ہوئے ان کے ٹکڑوں کو بھی لے لیں تو وہ اپنے طور پر ایک موضوع کو مکمل کر لینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ مثلاً

☆ وہ پاگل نرم سا خوشبو کا جھونکا
فضا کے زہر میں شامل ہوا ہے
وہی مقتول اب قاتل ہوا ہے (نظم خوشبو کا جھونکا)

☆ وہ، جو تاریک لبادے میں لپیٹے خود کو
دھیرے دھیرے مرے نزدیک چلی آئی تھی
میرے پیروں پہ گری
سر کی طرف بڑھنے لگی
آسماں اب مرے ہاتھوں سے چھٹے جاتے ہیں
اب زمینیں مرے قدموں سے جدا ہوتی ہیں
بستر مرگ پہ بیمار نے اک ہچکی لی
شب کی تاریک ردا چاروں طرف پھیل گئی (نظم: موت)

☆ ادھر سے وہ بھی یونہی مست و بے خود ہو کے آجائیں
کھلی بانہوں میں بانہیں ڈال کر
اپنا بنا جائیں
زمین و آسماں دیکھیں
ترانے گنگنا جائیں
محبت کا سفر ہے! (نظم: محبت کا سفر ہے)

اردو تنقید میں نظم کے مقابلہ میں غزل پر بہت لکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو

شاعری میں ہر دس افراد میں نو افراد محض غزلیہ شاعری میں طبع آزمائی کو شاعری کی معراج سمجھ لیتے ہیں۔ چند ہی ایسے لوگ ہیں جو غزل کے ساتھ نظم سے بھی رغبت رکھتے ہیں لیکن پچھلے ایک دہے میں یہ منظر نامہ تبدیل ہونے لگا ہے اور نظم بھی شعر گو حضرات کی توجہ اپنی جانب کھینچنے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرائد و رسائل میں غزلوں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں نظمیں بھی شائع ہو رہی ہیں لیکن عبدالرحیم نشتر کی نظمیں شروع سے ہی رسائل و جرائد میں پابندی سے شائع ہوتی رہی ہیں اور ان نظموں نے ادب کے سنجیدہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ بھی کر لیا تھا وہ اس لئے کہ عبدالرحیم نشتر اپنی نظموں میں کرتب بازی اور کمالِ اظہار کو جتانے کی کوشش نہیں کرتے۔ بہتر طور پر ترسیل و ابلاغ کو استوار کرنے کی زیادہ کوشش بھی انہیں نہیں کرنی پڑتی۔ زبان پر پوری طرح قابو ہونے کے باعث اور پھر اپنی نکھری ہوئی لفظیات کی فوری فراہمی پر اختیار ہونے کی وجہ سے وہ بڑی تیزی سے اظہار کے مرحلے طے کرتے ہیں۔ موضوعِ نظم کو منتخب کر لینے کے بعد کسی محل کے انتہائی حجرے تک پہنچنے کے لئے جس طرح مختلف دروازوں کو وا کرتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے اسی طرح وہ نفسِ نظم پر پہنچنے کے لئے ذیلی موضوعات کے دروازوں سے خود کو گزارتے جاتے ہیں۔ ان کا موضوع گو اچانک ابتداء میں نہیں آتا مگر موضوع کی گرمی نظم کی ابتداء ہی میں احساس کے لمس کو چھونے لگتی ہے۔ ان کی اکثر نظموں میں علامتی اظہار اپنے عروج پر ہے اور یہ نظمیں زیادہ طویل بھی نہیں ہیں بلکہ بڑی موثر ضرور ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

نیند آنکھوں میں اترتی ہی نہیں

چپ ہے آکاش

زمیں چپ ہے

ہوا ساکت ہے

چاروں اطراف ہے گمبھیر، پراسرار سکوت

یہ فضا سرد ہے اب

خوں میں مچلتی ہی نہیں

رات بیدرد ہے

ممثّی ہی نہیں (نظم: رات بے درد ہے)

عبدالرحیم نشترؔ کی مجموعی شاعری پر نظر ڈالنے کے بعد جو فوری تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ کہ نشترؔ نے اپنے طور پر مضامین وموضوعات چنے ہیں۔ ان کی ہر نظم میں تازگی خیالات کی بھر مار ہے۔ کہیں کسی کے خیال کا اعادہ نہیں ہے۔ نظموں کا آہنگ بالکل نیا نیا سا لگتا ہے۔ ان کی لفظیات، علائم اور استعارات، رنگین شیشے پر گرد کی طرح جمع نہیں ہوتے بلکہ شیشے کو پوری طرح رنگین بنانے کے عمل میں کوشاں ہیں۔ ان کی نظموں میں معنوی، صوری، صوتی اور اسلوبی خوبیوں کی کمی نہیں ہے۔

تقریباً پانچ دہائیوں سے عبدالرحیم نشترؔ نے بڑی خاموشی اور دلی لگن کے ساتھ اردو شاعری میں اپنی راہیں جو استوار کی وہ محمد علوی، بشیر بدر اور ندا فاضلی کی طرح ہنگامہ آفریں منظر نہیں دکھاتیں بلکہ عوام پسندی سے زیادہ خواص پسندی کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہیں۔

(۳۰/اپریل ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

عبدالرحیم نشتر کی نظم

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

تجربوں کے تیشے سے مسائل کی چٹانوں میں مسرت کی راہیں تراشنا اور بصیرت کی منزل تک پہنچنا آدمی کی فطرت رہی ہے۔ اس رہ نوردی میں نشاط آگیں فضا سے قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور آدمی فرطِ انبساط سے جھوم جھوم جاتا ہے۔ آدمی کی فطرت نے فنِ موسیقی میں تجربے کرکے اسے کلاسیکی سنگیت سے پوپ سنگیت تک پہنچا دیا ہے۔ مصوری میں تجربہ کیا تو تجریدی آرٹ کے نگار خانے سجادیئے۔ سنگ تراشی میں تجربے ہوئے تو پتھروں میں گویا روح پھونک دی اور جب شاعری میں تجربات ہوئے تو شعری قوسِ قزح مختلف رنگوں میں نمودار ہوگئی۔ جس کا ہر رنگ دوسرے سے مربوط لیکن اپنی ذات میں مکمل آزاد۔ شاعری میں تجربوں کی یہ روایت عرصہ سے چلی آرہی ہے۔ رواں صدی کے آخری چار دہوں سے البتہ اس میں کافی تیزی آگئی۔ ''جدیدیت'' کے سیلِ رواں نے اس کی رفتار میں بلا کا اضافہ کردیا ہے۔ ان تجربوں سے اردو شاعری کے چولے بدل رہے ہیں اور معنوی روح نئی آب وتاب سے ان میں سرائیت کرتی جارہی ہے۔

اردو شاعری میں صوری اور معنوی تجربات کو پسند کرنے والے شعراء کی فہرست میں ایک مشہور نام ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر کا بھی ہے۔ ان کی شعری تخلیقات محققانہ فراست، ناقدانہ ذہنیت اور شاعرانہ طبیعت کا حسین مرقع ہوتی ہیں۔ عصرِ حاضر کی پیچیدہ صورتِ حال، شکست وریخت کی بھٹی میں دم توڑتی ہوئی اقدارِ حیات ''بے حسی'' اور ''ناروا داری'' میں پروان چڑھتی

ہوئی ہماری معاشرت میں علمی وتکنیکی رجحان کی عدم موجودگی اور فنونِ لطیفہ میں اس کا ذوقی افلاس بلکہ بقول شخصے ''بدذوقی'' نے نشتر کی شاعری کو کاٹ دار لہجہ دیا ہے۔سماج کی ناقدری، طرزِ تغافل اور آزمائش کی چکی میں بلاوجہ پسوائے جانے کی وجہ سے نشتر کی شاعری میں ''باغیانہ انقلاب'' کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔وہ بڑی حساس طبیعت کے مالک ہیں اس لئے وقتی اور ہنگامی موضوعات بھی ان کی شاعری میں بڑی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں اور ان کی بے کل ومضطرب روح ان میں تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جدید نظم میں ارتکازِ نظم کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔قافیہ پیمائی اور عروضی اوزان وہاں ثانوی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔عروضی آہنگ کی بہ نسبت اظہار کے آہنگ کو جدید نظموں میں فوقیت حاصل ہے۔شدتِ اظہار اور عقلی استدلال کے ساتھ ساتھ رمز وایمائیت کے سہارے ان میں زور تاثیر پیدا کیا جاسکتا ہے۔ان نظموں میں اس لئے تخیل کی بجائے تفکر اور تصور کی بجائے تاثر کی کارفرمائی رہتی ہے۔نشتر نے اپنی نظموں میں ان سب کا نباہ کیا ہے۔ذیل کے تجربے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔''چارہ ساز'' نشتر کی نظم ہے۔اس میں دیوی کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔امہاتی نظامِ معاشرت میں عورت ہمیشہ دیوی کی شکل میں پوجی گئی ہے۔قدیم عراقی تہذیب میں ''نینا'' کی شکل میں پوجی گئی جسے تقدس پہاڑ کی ملکہ کہا جاتا تھا۔یہ تصور برادرانِ وطن کی دیوی ''پاروتی'' سے ملتا جلتا ہے۔یہ رحم وقہر کی دیوی تھی۔مصر میں عورت ''نوط'' (آسمان کی دیوی) اور آئی سس (چاند کی دیوی) متصور کی جاتی ہے۔بعد میں ''قلوپطرہ'' کو نیم مذہبی مقام حاصل ہوگیا تھا لیکن یہ دیوی نہ بن سکی البتہ عورت کی شکل میں یہ مردوں پر فائق گردانی گئی تھی۔ملکِ شام میں ملک حطی قوم نے ''استارنہ'' دیوی کی شکل میں عورت کو معبود سمجھا تھا اور اس کی عبادت شہوت پرستی اور جنسی ہوس رانی کی وجہ سے کی جاتی تھی۔کریٹ والوں نے ''مادرِ فطرت'' کی حیثیت سے عورت کو دیوی بناڈالا تھا۔اس دیوی کی سواری شیر تھی۔یہ دیوی ہندوستان کی دُرگاہ کے مشابہ تھی۔یونانیوں کے یہاں چند اور دیویاں تھیں۔ان میں ہیرا (Hera) شادی کی دیوی، ہسٹیاں (Hestia) چولہے کی دیوی، سیلن (Selen) چاند کی دیوی، پرسفیون (Persphone) مشہور تھی۔لیکن

ایفروڈائٹ کی زیادہ پرستش کی جاتی تھی۔ برادرانِ وطن کی یہاں دُرگا، پاروتی، ادیتی، امبا، مہا کالی، شاردا اور اوشا وغیرہ دیویاں پوجا کے لائق سمجھی جاتی تھیں۔ ان دیویوں کے علاوہ دا کنا، منات، کیوپڈ وغیرہ دیوی ردیویوں کو بھی کام کی شکل میں پوجنے کا اہتمام دورِ تاریخ کے شروع تک ملتا ہے۔ سماج میں دیویوں کی پرستش اور پوجا کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو خوف اور دوسرا تسکینِ جنسی، پدری نظامِ معیشت(Patriarchalism) میں اگرچہ مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل تھی لیکن پھر بھی عورت کی پرستش جنسی لذت یابی کے لئے ہی کی جاتی تھی اور اس اعتبار سے عورت کو ''چارہ ساز'' تسلیم کیا گیا تھا۔ 'دکھ ہرتا' اور 'سنہارتی' جیسی صفات سے اسی لئے ان دیویوں کو متصف کیا گیا ہے۔

نشترؔ نے اس سماجی نفسیات کو دورِ جدید کے حوالے سے اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ عورت جو ''دیوی'' بن کر ''ڈائن'' کا کام کر رہی ہے۔ مرد لذت کوشی اور منفعت پسندی کی خاطر اس ''دیوی پن'' کو مان کر اس کی پرستش کر رہے ہیں۔ اس نے اگرچہ دنیا میں بے چینی اور بدحوسی پیدا کر رکھی ہے، لیکن مفاد پرست مرد پجاری بن کر اس کو پوج رہے ہیں، اس کی فوقیت کو قبول کر رہے ہیں۔ اسے چارہ ساز سمجھ رہے ہیں۔ دنیا کی عصری سیاست کے تناظر میں، جہاں عورت کی ''قوامیت'' کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ نشترؔ کی نظم ''چارہ ساز'' بڑی معنی خیز بن جاتی ہے۔ نظم کے خاتمہ پر شاعر طنز کا ایک بھرپور طمانچہ مرد کے چہرے پر رسید کرتا ہے۔

چٹورے، مفت خورے
سب پجاری رقص کرتے ہیں
نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں
وہ دیوی ہے کہ ڈائن ہے
نہیں کھلتا یہ راز اب تک
سمجھ رکھا ہے پجاروں نے اس کو
چارہ ساز اب بھی!

یہ نظم ڈھونگی پنڈتوں اور بناوٹی ملاؤں کے ''چٹورے پن'' اور ''مفت خوری'' کا پردہ فاش کرتی ہے اور ان کی ''قلاش ذہنیت'' اور ''نکمے پن'' پر کرارا وار کرتی ہے۔

''رنگ اڑے'' یہ نظم ہولی کے تہوار کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ البیلی متوالی ٹولیوں کے مستوں کی مستی بھری شرارتوں سے رنگ اڑانے کا یہ رنگ ہندوی روایات کا حامل ہے۔ باطل کی حق پر فتح اور برائیوں کے مکمل خاتمے پر خوشی کے اظہار پر یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ ہولی پر از ابتداء تا حال اردو ادب میں مختلف نظمیں ملتی ہیں۔ صوفیائے کرام نے بھی برادرانِ وطن کے اس تہوار کو بہ نظرِ تحسین دیکھا ہے اور اپنی فراست و دلچسپی کے مطابق اس پر طبع آزمائی کر کے روحانیت کی تعلیم دینے کے لئے اسے ایک وسیلے کے طور پر اپنایا ہے۔ لیکن نشتر کی نظم ''رنگ اڑے'' میں رنگوں کے در پردہ عصری دور کی ''بھان متی راج سنگھاسن'' حقیقت وا شگاف کی ہے۔ ہرینہ کیشپ نے اپنی سیاست چلانے کے لئے اپنی بہن ہولی کے ہمراہ اپنے بیٹے کو آگ میں بٹھا دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ ہولی کو تو آگ کا وردان ملا ہے۔ آگ اس کو نہیں جلائے گی اور پرلہاد جو ہرنیہ کیشپ کی سیاست کے لئے گہن ثابت ہو رہا تھا، بھسم ہو جائے گا۔ لیکن راج سنگھاسن کی یہ بھاگ متی اس کے حق میں الٹی ثابت ہوئی۔ چنانچہ آگ میں پرلہاد تو بچ گیا لیکن ہولی جل گئی۔ ہرنیہ کیشپ اس طرح اپنی سیاسی چال میں ناکام ہو گیا۔ نشتر اس واقعہ کو ہولی کے پس منظر میں آج کی سیاست پر منطبق کرتے ہیں۔ آج بھی ہزاروں ہرنیہ کیشپ پرلہاد (حق) کو مارنے کے لئے ایسے ہی سیاسی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ راج سنگھاسن اس طرح ایک نہ ایک دن ضرور حاصل ہو جائے گا۔ نشتر کی نظموں کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان کا clue آخر میں کھلتا ہے۔ شاعر اس نظم کا سارا بھید آخر میں اس طرح کھولتا ہے۔

بھان متی نے راج سنگھاسن کی آشا کب چھوڑی
بجھتے ہردئے بھیتر اب بھی جان بچی تھی تھوڑی
کیا جانے کب مہربان ہو جائے یہ ہوا نگوڑی
یوں بھی تو انداز بدلتے رہتے ہیں ہولی کے

رنگ اڑے ہولی کے..........................

شاعر نے ''نیل کنٹھ'' اور ''پیار کا امرت'' جیسی خالص ہندو اساطیری اصطلاحات کو برجستہ اور برموقع اپنے صحیح معنوں میں استعمال کیا۔ سمندر منتھن کے موقعے پر زہرِ ہلاہل شنکر کے حصے میں آگیا تو اس نے پی لیا جس سے اس کا گلا نیلا پڑ گیا۔ اس لئے اسے ''نیل کنٹھ'' کہا جاتا ہے۔ زہر پی کر اس نے امرت دوسرے دیوتاؤں کو دے دیا تھا۔ شاعر نے ان اصطلاحات کو بڑی معنوی خوبیوں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس نظم کا ایک بند۔

بیرن پُروائی نے پہلے نخرہ خوب دکھایا
پریم سندیسہ روکے رکھا دیاکل من ترسایا
انگ انگ میں برچھا گھونپا سیروں لہو رلایا
گھاؤ بھلا کیسے بھولیں گے اس چنچل ہولی کے
رنگ اڑے ہولی کے..........................

میں جغرافیائی حقائق کی صحیح تعبیر کی ہے۔ پُروائی یعنی مشرقی ہوا بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ایسی سرد راتوں میں پیا بن برہن دیاکل من ہو کر کروٹیں بدلتی رہتی ہیں۔ پُروائی برہا (ہجر) کی آگ کو اور تیز کر دیتی ہے لیکن گرما کے گرم موسم میں آنے والی ہولی کے موقع پر پیا ملن ہو جاتا ہے اور پچکاریوں سے چھوٹنے والے ہولی کے رنگوں میں برہا کی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ نظم میں شاعر کا یہ اندازِ تغزل اپنے آپ میں انوکھا ہے۔

''تعصب'' میں عبدالرحیم نشتر نے ہندوستان کی عصری سیاست میں سیاسی استحکام کے لئے پھیلائی جانے والی منافرت کے دوررس اثرات کو پیش کیا ہے۔ جب تک یہاں سلاطین کی حکومت تھی، یک جہتی کے سہارے انہوں نے اپنی حکومت بنائے رکھی تھی۔ لیکن انگریزوں کو ہندو مسلم اتحاد میں اپنی حکومت واقتدار کی نیا ڈوبتی ہوئی دکھائی دینے لگی تو انہوں نے منافرت کے بیج بو دیئے اور یہاں کے مورخوں کو ''سر'' کا خطاب دے کر ان سے ایسی الٹی سیدھی تاریخ لکھوائی جس سے منافرت پھیلتی گئی اور یک جہتی کی جڑیں کٹتی گئیں۔ آزادی کے بعد سیکولر ذہن کے لوگوں کی پارٹی نے جب عنان حکومت سنبھالی تو قومی

یک جہتی کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ دراں حالیکہ کچھ فتنہ پرور ضرور ایسے موجود تھے جنہیں ہندو مسلم اتحاد کبھی بھاتا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ آئے دن کچھ نہ کچھ الجھاؤ کی صورت پیدا کر کے فسادات کروا دیتے اور اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو جاتا۔ تعصب کا یہ زہر ان کی رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا۔ حکومت پر قابض ہونے کے لئے وہ یہ کھیل کھیلتے رہے اور آج بھی اس کھیل کو کھیلا جا رہا ہے۔ ایسی منافرت پسند ذہنیت کے ذریعہ پھیلائے جانے والی تعصب کی سم ناکی سے متاثرہ اذہان کے کرب کی داستان اس نظم میں بیان کر دی گئی ہے۔ شاعر نے رمز و ابہام کا استعمال کر کے توسیع و تصریح سے اجتناب برتا ہے۔

''اس سال'' عبدالرحیم نشترؔ کی نظم ''غمِ ہجراں'' کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے۔ وطن، خاندان اور بال بچوں سے سینکڑوں میل دور عید کی پر مسرت موقع پر ہجر کا کرب انہیں بے چین کر دیتا ہے۔ تصور میں ''صورتِ جمیل'' اور ''مکھڑا سرور کا'' آجاتا ہے جو ان کے لئے ''چاند دور کا'' بن گیا ہے اور جس کے ''لمسِ لطیف'' کے لئے ان کی انگلیاں ترس رہی ہیں۔ وصل کی خواہش سینے میں کروٹیں بدل رہی ہیں۔ یہ ساری بے کیف اور پژمردہ کیفیات ان کے جذبات کو سرد کر دیتی ہیں اور عید کی خوشیاں غم میں ڈھلنے لگتی ہیں۔

غرض کہ نشترؔ کی نظموں میں ''غمِ جاناں'' سے زیادہ ''غمِ دوراں'' کا جذبہ موجزن دکھائی دیتا ہے۔ عصری حسیت ان کی شاعری کی جان ہے۔ وہ خود بہت حساس ہیں اس لئے معاشرے میں پنپنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات دیکھ کر متاثر ہو جاتے ہیں اور ان متاثرہ جذبات کو اشعار میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ رہی ہے کہ ان کی نظموں میں روانی بہت ہے۔ ٹھہراؤ کی کیفیت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

(مشمولہ شاہین جلگاؤں، مرتبین: معین الدین عثمانی اور صغیر احمد)

☆☆☆

عبدالرحیم نشترؔ کی شاعری کی قوسِ قزح

ڈاکٹر محسن جدگانوی

اردو شاعری میں نظم نگاری کے ابتدائی نقوش محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں دستیاب ہیں لیکن نظم نگاری کو جس شاعر نے زمینی وسعتیں دیں وہ بلاشبہ نظیرؔ اکبرآبادی ہی تھے تاہم اس عہد تک اردو شاعری کا تنقیدی شعور بالیدہ نہیں ہو پایا تھا۔ مغربی نظم سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد نے جس جدید نظم کی وکالت کی تھی اور جسے الطاف حسین حالی نے آگے بڑھایا تھا اس میں تبدیلی کے باوجود روایتی ہیئت کی موجودگی اور موضوعی نظم نگاری کا مفہوم آج کے عہد کی جدید نظم سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ عبدالحلیم شررؔ کی بناء کردہ معریٰ اور آزاد نظم کے ابتدائی نمونوں نے ہی جدید نظم کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اقبال کے یہاں نظم کو نئی ہیئت اور نئی لفظیات ملیں۔ بعد کے مراحل میں ترقی پسند تحریک کے عہد میں تنقیدی نظریوں کے ادب کا وجود ظہور پذیر ہوا جس کے تحت مربوط و مرتکز نظم پر زور دیا گیا۔ خالص نظم کے شاعر اختر الایمان کی مرتکز نظمیں اس کی ترقی یافتہ شکل اور بہترین مثال ہیں۔

جدید نظم جو آزاد اور معریٰ نظم کے Format میں حلقۂ اربابِ ذوق کے زیرِ اثر لکھی گئیں ابتداء میں میراجی اور ن م راشد کی آواز اور پہچان بن کر قرطاسِ ابیض پر نمودار ہوئیں۔ ان نظموں میں ڈرامائی کیفیت والی نظم نگاری کا تجربہ حاوی رہا۔ اسی طرز کو ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر فروغ ملا۔ یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ اردو نظم کی ترقی میں ترقی پسند تحریک کا بہت

بڑا ابھر رہا۔ ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جیسے کئی شاعر اس کی ترویج میں پیش پیش رہے۔ اس شاعری نے قنوطیت اور یاسیت پیدا کرنے والی شاعری کی نفی کی اور اس عہد میں پھیلے ہوئے انتشار، افراتفری اور انحطاط کے مسائل و موضوعات اور انسانی دردمندی کے امور پر توجہ دی۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند شاعری نے شعوری اور لاشعوری طور پر اس دور کے ہر شاعر کو متاثر کیا۔ حتیٰ کہ قیصر الجعفری جیسے کلاسیکل شاعر جو تحریک سے کبھی وابستہ نہیں رہے ان کے یہاں بھی اس شاعری کا عکس اتر آیا۔

گاؤں سے دور جو پردیس کے گیہوں مہکے
بھیڑ سی ٹوٹ پڑی شہر پہ کنگالوں کی

زندگی خوار و زبوں پھرتی ہے بازاروں میں
لاش کاندھے پہ اٹھائے ہوئے بنگالوں کی

بھوک کی آگ بھڑک اٹھتی ہے بستی بستی
آدمی سر بہ گریباں ہے یہ عالم کیا ہے

ایسے شعلوں سے جو بھر جائے زمیں کا سینہ
یوجنا وٗں کی برستی ہوئی شبنم کیا ہے

زندگی میں جب تغیرات پائے جاتے ہیں تو ادب میں مشاہدے، تجربے اور تجزیے اپنا تخلیقی منظرنامہ تشکیل دیتے ہیں چنانچہ چھٹی دہائی میں رونما تبدیلیوں نے فکر و احساس کی رو کو بھی متاثر کیا۔ مشاہدات و تجربات نے تخلیقی وسیلے بھی ڈھونڈ نکالے۔ نئی فکر نے اظہار کی ترسیل کے لئے نئی لفظیات، نئی اشاریت، نئی علامتیں، نئے تلازمے تلاش کئے اور اپنے کرب اور ریزہ ریزہ ہوتی ہوئی شخصیت اور ذات کو نئے اظہار کا اسلوب پہنایا۔ اس نئے اظہار میں موجودہ عہد

کے بکھرے ہوئے آدمی کی ذات بھی تھی اور سماج کی بدلتی اقدار کی شکست و ریخت بھی۔
عبدالرحیم نشتر نے اپنے عہد کے آشوب کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اسے جیا بھی ہے۔ ان کی نظمیں
''اسیرِ جنگ'' اور ''شعلۂ زخم'' عصرِ حاضر کے انہی مسائل کی آئینہ داری کرتی ہیں۔

کب رہا ہوگا میں
اور کب مرے بچے میرا پیار پائیں گے
کب تمہارے سینے کا ارتعاش کم ہوگا
اور جتنے قیدی ہیں
مشترک ہے سب کا غم
سب کی سوچ یکساں ہے
جانے ریڈیو پر ہم کس طرح یہ کہتے ہیں
ہم بھی مزے میں ہیں، خیریت سے رہتے ہیں (نظم: اسیرِ جنگ)

اور نظم ''شعلۂ زخم'' سے یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو۔

اس خرابے میں شورِ فغاں کے سوا
دوسری کوئی آواز زندہ نہیں
خندقِ درد میں ہے سکوتِ سخن
دھڑکنوں میں کوئی ساز زندہ نہیں
مہرباں کون ہے درصفِ دشمناں
زد پہ آجاؤں تو کیسے چھوٹے گی جاں
چاروں جانب حصارِ ہوس خیمہ زن

لیکن محض اس قبیل کی نظموں سے ان کی شاعری کا مکمل جائزہ نہیں لیا جا سکتا کہ ان کی نظموں کی
فکر میں حد درجہ تنوع ہے۔ ان کی نظموں میں ان کا فلسفہ محبت بھی ہے اور معاشرے و زمانے کے
معاملات بھی۔

جدید رجحان کے ابتدائی برسوں میں چند پر جوش اور نو آمدہ لکھنے والوں کی انجمن

پسندی نے ابہام وایہام کے موضوعات ومضامین کو جدید شاعری سے منسوب کر کے اسے مطعون کرنے کا لایعنی عمل انجام دیا لیکن عبدالرحیم نشتر کی شاعری اس عبوری دور میں بھی ان تمام بدعتوں سے محفوظ ومامون رہی۔ان کی شاعری اور نظم نگاری کی کئی جہتیں ہیں۔ان میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی جہتیں زیادہ واضح ہیں۔ان کی رومانی شاعری میں نفسیاتی کرب کی جمالیاتی رو کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان نظموں میں ان کے نوسٹلجیا(NOSTALGIA) کے نقوش کی برانگیختگی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نہ میں اس کی طرف دیکھوں
نہ وہ میرے لیے سوچے
نہ آنکھیں کھل کے روتی ہیں
نہ دل پوری طرح تڑپے
ندی کے دو کناروں کی طرح خاموش رہتے ہیں
ذرا سی بدگمانی کا ستم دونوں ہی سہتے ہیں (نظم: ذراسی بدگمانی)

اور..........

شام اجلے پروں کی قبا اوڑھ کر
پھر اسی اجڑے بجڑے کھنڈر کی طرف
کس لیے آگئی (نظم: شعلۂ زخم)

تخلیقی عمل اپنے گردوپیش سے دامن نہیں بچا سکتا، تجربوں اور تاثرات کے تجسیمی پیکر اسے خارجی دنیا ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔جس ماحول واکناف میں وہ زندگی بسر کرتا ہے خارجی تجربے کا وہ ایک خاص ثانیہ ایک ثانیۂ تنویر بن کر اس کے ادراک میں متنِ حاصل بن کر محفوظ ہو جاتا ہے۔تخلیق کار کی شخصیت علامت، تخلیق اور تجربے کے درمیان ایک درمیانی کڑی سی ہوتی ہے۔وہ اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور معاشرے کا مختلف زاویے سے جائزہ لیتا ہے۔اس کی تجزیہ کاری سے

اس کے ذہنی تجربات میں وسعت آتی ہے۔ تخلیقی صورت گری کے لئے حرف وصوت کے رشتے، لفظ وخیال کے وسیلے سے لسانی، صوتی، فنی اور ہیئتی تشکیل کی صورتیں اختیار کرتے ہیں جو تہذیبی، معاشرتی اور نفسیاتی عوامل کو اور اک کی زاویے عطا کرتے ہیں۔ تخلیق کے لئے لفظ وخیال اساسی حیثیت کے مماثل ہیں۔ نئی شاعری زندگی سے گریزاں نہیں بلکہ اس میں ہمیں اپنے عہد کے پیچیدہ مسائل، زندگی کا المیہ، تنہائی کا شدید احساس، فرد کی شکست وریخت، ذات کا کرب اور عہدِ حاضر کی سنگینیوں کی فکرانگیز فضا ملتی ہے۔ تنہائی کا درماندہ احساس جو ہمارے عہد کے آدمی کا سب سے بڑا المیہ ہے وہ فرد کی زندگی میں باہر سے لایا ہوا مستعار احساس نہیں ہے بلکہ حالات کا پیدا کردہ ہے۔ عبدالرحیم نشتر کی نظمیں فرد کی شخصیت اور سیاسی جبر وعصبیت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ نظم ''مجھے تو قتل ہونا ہے'' کا یہ اقتباس دیکھئے۔

وہ کنجِ عافیت جو خواب بن کر جگمگاتا تھا
غبارِ حسرتِ تعبیر بن کر منہ چڑاتا تھا
کہیں اجڑی ہوئی گلیاں
کہیں بکھرا ہوا ملبہ
کہیں ٹوٹیں ہوئیں شاخیں
ادب، تہذیب
تاریخ تمدن خون روتے ہیں
کہیں مذہب،
کہیں مسلک،
کہیں کچھ اور دیواریں
مرے چارہ گروں کو قدرے آسانی میسر ہے
نئے نعروں،
نئے 'ہتھیار' لفظوں سے مزین ہیں

وہ میرے پاس آئیں گے
نئے قصّے سنائیں گے
انہی پہ کان دھرنا ہے
انہیں دل میں سمونا ہے
مجھے تو قتل ہونا ہے!

ان کی نظم ''تعصب'' میں بھی سیاسی عصبیت و جبری عفریت کیخلاف ایک احتجاج ہے، ایک نوحہ ہے۔

محبت
عصبیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا
چہرہ سجاتی ہے
مجھے نیچا دکھاتی ہے
کہ اب وہ
اپنی مٹی
اپنی دھرتی کی طرف
پینگیں بڑھاتی ہے
رفاقت،
ہجر کے صدمے اٹھاتی ہے
تعصب.........!
اس قدر بھی خون میں شامل رہیگا
کیا پتہ تھا.........؟

نئی شاعری نے خارجی عوامل کا بھی بہ نظر غائر مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے اور ان میں تجربات کے امکانات تلاش کئے ہیں۔ ان امکانات کو نئی پیکر تراشی کے ذریعہ نئی معنویت دی ہے۔ ان نئی علامتوں میں مظاہرِ فطرت سے متعلق تمام علامتیں ہیں جن کا تعلق زمان و مکان

سے ہے۔ عبدالرحیم نشتر کی نظموں کا استعاراتی نظام نئی علامتوں، نئی لفظیات وتراکیب کا پیکر اوڑھے جدید نظم کے افق کی فضا کو قوسِ قزح کے مختلف رنگوں سے آراستہ کرتا ہے مثلاً شام کا اجلے پروں کی قبا اوڑھنا، خرابے کا شورِ فغاں، خندقِ درد کا سکوتِ سخن، حصارِ ہوس خیمہ زن، پودوں سے ٹوٹے ہوئے رنگ، ننگے پیروں کی گدگدی، تماشہ گہرِ آب وگل، شاخِ ہجرت سے نئی پروازیں، صفِ اشجار کے تازہ منظر وغیرہ۔ عبدالرحیم نشتر کے اس صوتیاتی واستعاراتی آہنگ نے ان کی نظموں میں شعاعِ رنگ ریز کے بادباں پھرادیتے ہیں۔ ان کی نظم ''وہ آرہی ہے'' میں رنگین منظر کی کہکشاں جس رنگ وروپ میں نکھر آئی ہے اس کا ایک مختصر سا اقتباس یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

کہاں سے اتنے پر جمال ودلکشش
رنگ سے بکھر گئے
طیور گنگنا اٹھے
شگوفے مسکرادیئے
سفید وسرخ وچمپئی
نیلے، پیلے، جامنی
سنہرے، سیمیں، شربتی
اٹھے بنفشئی وقرمزی
ارغوانی، سرمئی، زمردیں
زمیں کا سبز پیرہن دمک اٹھا
ہزار رنگ خوشبوؤں کا جام ہی چھلک اٹھا
میں نے ایک گھونٹ لی
لب بھی تر ہوئے نہ تھے
بہک گیا!

نئی نظم کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس نے جدید شعور کی مدد سے روحِ عصر کو پہچانا اور اس کی فکر کا دائرہ افق سے کائنات تک پھیل گیا۔ فرد کی زندگی دائرہ در دائرہ پھیلتی جارہی ہے۔ روحِ عصر کی شاعری، فرد کے گرد پھیلے ہوئے لاتعداد دائروں کے سمٹنے کے بعد وجود میں آئی ہے۔ نئی ہیئت نے تخلیقی فکر کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ نئی نظم، نئے طرزِ احساس، اسلوب کی آبیاری میں عبدالرحیم نشتر کا جو گراں قدر حصہ ہے وہ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔

(۶ر فروری ۲۰۰۹ء)

☆☆☆

عبدالرحیم نشتر کی نظموں میں موضوعاتی تنوع اور صوتیاتی آہنگ

عبدالاحد ساز

۱۹۷۰ء کے دہے کے اوائل میں یا اس سے چند برس قبل ہی جدید اردو شاعری کے خیموں سے کچھ نئی اور توانا آوازوں کا اضافہ ہوا تھا۔ جدید شاعری اپنے عروج کے مدارج طے کر کے کسی قدر نشیب کی طرف مائل تھی۔ مگر ان چند متوجہ کن آوازوں میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ جدید شاعری سے عمومی طور پر منسوب غیر ضروری ابہام اور ازکار رفتہ داخلیت سے یہ یکسر مبرا تھیں۔ جہاں تک شعری و ادبی شناخت کی یافت کا معاملہ ہے، ایک حد تک تو وہ انفرادی صلاحیت اور ریاضت ہی پر منحصر ہوتا ہے، مگر اس کے کچھ ظاہری پہلو، فن پاروں کی مناسب ترویج، متواتر اشاعت، قارئین تک بروقت رسائی اور ناقدین کی مرکوز توجہ میں بھی مضمر ہوتے ہیں۔ شاعر یا ادیب کی سرعتِ پیش کش و پیش رفت یا تساہل، توجہ یا عدم توجہ اس پر مستزاد ہیں۔ چنانچہ قابلِ شناخت ناموں کے زمرے میں بھی کچھ نام واضح اور کچھ نسبتاً مدھم رہ جاتے ہیں۔ عبدالرحیم نشتر کو اسی زمرے میں اہمیت کے ساتھ شمار کیا جانا چاہئے جن پر مبصرین و ناقدین نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔

ہم ۷۰ء کی دہائی کے اواسط سے آغازِ سفر کرنے والے شعراء (بشمول احقر) عبدالرحیم نشتر کو اپنے فوری پیش رووں میں پاتے ہیں یعنی ان قدرے سینیئر معاصرین

میں جنھوں نے ہمیں قریب سے متوجہ کیا تھا۔ اب قریب تیس برسوں بعد جب ہم نشتر کے کلام کو وسیع تناظر میں اور معروضی نگاہ سے دیکھتے ہیں (اور راقم الحروف نے اسے اپنے ادنیٰ شاعر ہونے کی حیثیت ہی سے دیکھا ہے کہ اپنے ناقد ہونے کا نہ کوئی زعم ہے اور نہ اس کا کبھی دعویٰ ہی کیا ہے) تو بعض نکات واقعی دادطلب اور لائقِ استحسان برآمد ہوتے ہیں، جن کے تعلق سے اس سوال کا اٹھنا بھی حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام کو ان محاسن کی رو سے اب تک کیوں نہیں دیکھا گیا۔

مثلاً اگر ہم نشتر کی شعری بیاضوں سے بغیر کسی منصوبہ بند زمانی یا معنوی ترتیب کے، اِدھر اُدھر سے (At Random) کچھ نظمیں چن لیں اور انہیں یک جا دیکھیں تو فوری طور جو اوصاف متاثر کرتے ہیں، وہ ہیں موضوعات کا اچھا خاصا تنوع، حسن و جمال سے رغبت و انسیت اور اظہار و ترسیل میں ایک صوتی رکھ رکھاؤ، جسے لفظوں کی نشست و برخاست، ہم قافیہ مصرعوں کی تراتیب اور نظم آرائی کے قرینوں میں بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے۔

پہلے موضوعات کے تنوع کے ضمن میں چند نظموں کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے جو بغیر کسی شعوری کوشش کے اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً عصرِ حاضر کی معاشرتی و سیاسی سفاکی اور استحصال کا یہ ردِ عمل۔

ادب، تہذیب،
تاریخِ تمدن خون روتے ہیں
کہیں مذہب،
کہیں مسلک،
کہیں کچھ اور دیواریں
مرے چارہ گروں کو قدرے آسانی میسر ہے
نئے نعروں،
نئے 'ہتھیار' لفظوں سے مزین ہیں
وہ میرے پاس آئیں گے

نئے قصّے سنائیں گے
انہی پہ کان دھرنا ہے
انہیں دل میں سمونا ہے
مجھے تو قتل ہونا ہے!

(نظم: مجھے تو قتل ہونا ہے!)

اس عہد کے اندازِ محبت کی تبدیل شدہ نفسیات کا یہ رخ۔

وہی بھیگا ہوا موسم
وہی ٹھنڈی ہوائیں ہیں
وہی ہے صبح روح افزاء
بدن بھی جگمگاتے ہیں
مگر احساس گھائل ہے
نہ میں اس کی طرف دیکھوں
نہ وہ میرے لئے سوچے
نہ آنکھیں کھل کے روتی ہیں
نہ دل پوری طرح تڑپے
ندی کے دو کناروں کی طرح خاموش رہتے ہیں
ذرا سی بدگمانی کا ستم دونوں ہی سہتے ہیں

(نظم: ذرا سی بدگمانی)

اور ایک دھندلی سی کیفیت سے ابھرتی ہوئی گداختگی کا یہ بالکل ہی مختلف ایکسپریشن۔

شام اجلے پروں کی قبا اوڑھ کر
پھر اسی اجڑے بچھڑے کھنڈر کی طرف
کس لئے آ گئی
اس خرابے میں شورِ فغاں کے سوا

دوسری کوئی آواز زندہ نہیں
خندقِ درد میں ہے سکوتِ سخن
دھڑکنوں میں کوئی ساز زندہ نہیں
مہرباں کون ہے در صفِ دشمناں
زد پہ آجاؤں تو کیسے چھوٹے گی جاں
(نظم: شعلۂ زخم)

یا پھران سے یکسر الگ یہ برہنہ اسلوب و تلخ کلامی ۔

اگر یہ سؤر، غلاظتوں پر، لپک لپک کر
اسی طرح دانت تیز کرلیں
تو کل یہ بستی........ یہ ساری بستی
جو آج محفوظ و بے اثر ہے
سفید سؤر کی خصلتوں سے بھی بے خبر ہے
یہ کل نیا چارہ بن نہ جائے
تماشا کیا دیکھتے ہو، آؤ
انہیں پکڑلو، انہیں گراؤ
انہیں سلاخوں میں بند کرلو
تنی ہوئی تو ند چیر ڈالو
سفید سؤر، غلاظتوں پر، لپک لپک کر
سنہرا فضلہ چبا رہے ہیں
(نظم. سفید سؤر)

موضوعات کے اس حیرت انگیز تنوع کے درمیان جب مزید غور کیا تو قابلِ توجہ ایک اور زاویہ بھی اجاگر ہوا۔ موت کا احساس یا تصورِ مرگ مختلف اضمان و سیاق میں نشتر کے یہاں ایک تواتر سا رکھتا ہے۔ کہیں براہِ راست موضوع کی سطح پر، کہیں احساس کی زیریں رو میں اور

کہیں ایک موڈ کی تشکیل کرتے ہوئے۔ براہِ راست اظہار کی مثال کے طور پر نظم ''موت'' کی آخری چند سطریں دیکھیے۔

مسکراتی ہوئی دزدیدہ نگاہی کو بچائے ہوئے
دیکھا اس نے
وہ، جو تاریک لبادے میں لپیٹے خود کو
دھیرے دھیرے مرے نزدیک چلی آئی تھی
میرے پیروں پہ گری
سر کی طرف بڑھنے لگی
آسماں اب مرے ہاتھوں سے چھٹے جاتے ہیں
اب زمینیں مرے قدموں سے جدا ہوتی ہیں
بسترِ مرگ پہ بیمار نے اک ہچکی لی
شب کی تاریک ردا چاروں طرف پھیل گئی......

اور اس کے بالکل برعکس موت کو ایک خالص جمالیاتی فریم میں فروزاں کرتی ہوئی نظم ''دودھیا بادلوں کی سواری'' کا یہ خوبصورت کلائمکس۔

آسماں سے فرشتے اترتے ہوئے
میری دھرتی کو پرنور کرتے ہوئے
مخملیں سبز پوشاک پہنے ہوئے
سرمئی کوہساروں کی آغوش سے
صاف و شفاف جھرنوں سے بہتے ہوئے
موج در موج نیچے اترتے ہوئے
کیا خبر تھی کہ یوں بھی چلے آئیں گے
اور مجھے اپنے ہمراہ لے جائیں گے
کہہ دو آنسو بہائے نہ کوئی نگی

جیسا کہ آگے عرض کیا گیا جمالیاتی پیرائے اور تلازمے نشترؔ کی نظموں میں ایک جاری کردار رکھتے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ تو مذکورہ بالا اقتباسات سے بھی ہو جاتا ہے، مزید توثیق کے لئے جا بجا کئی اظہاریے ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ عام طور سے کسی بھی فنکار کے یہاں، خواہ وہ فنونِ لطیفہ کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، حسنِ فطرت سے لگاؤ اور قدرتی مناظر سے حظ اندوز ہونے کی صلاحیت موجود ہوتی ہی ہے۔ وہ فنکار جو خصوصاً جمال پسند طبیعت کے مالک ہوتے ہیں، اپنے اندر اس عنصر کا تناسب سوا رکھتے ہیں۔ یہی بات نشترؔ پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک خوبصورت اظہاریہ شرفِ نظر ہو۔

میری آنکھوں سے کیسے ستارے گرے
میرے دل میں یہ کیسا کھلا آسماں
کیسے چنگھاڑتے ابر لہرا گئے
کیسی گرنے چمکنے لگی بجلیاں
موسلا دھار برسات ہونے لگی
پھر شرابور ہونے لگے جسم و جاں
کس طرح پاؤں میرے اکھڑنے لگے
کس طرف لے چلا مجھ کو سیلِ رواں
میں تو نکلا تھا گھر سے اسے دیکھنے
مجھ کو آواز دے کر کہاں چھپ گئی
آسماں پر چمکتی ہوئی کہکشاں

(نظم: آسماں پر چمکتی ہوئی کہکشاں)

جہاں تک صوتی آہنگ کا تعلق ہے اسے بہ آسانی شاعر کی جمالیاتی ترجیحات سے جوڑ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ نشترؔ کی بیشتر نظموں میں چاہے وہ پابند ہوں، معرّیٰ ہوں یا آزاد ہوں اور موضوع کے لحاظ سے ان کے چہرے کتنے ہی مختلف ہوں، صوتی پیکر تراشی کا عمل ان میں کافی حد تک مشترک نظر آتا ہے۔ الفاظ کی غنائی دروبست کے علاوہ ہم قافیہ مصرعوں کی مختلف اور

متبادل تراتیب (Permutation) کی صوتی حسن کاری، کشش اور جاذبیت کا باعث ہوتی ہے۔ فیض احمد فیض اور ن م راشد کی کئی نظمیں اس عمل کی عمدہ ترین مثالیں ہیں۔ ان کے بعد کئی شعراء کے یہاں اس کا اتباع ملتا ہے۔ اس نقطے کی تھوڑی سی وضاحت کے لئے کیوں نہ فیض کی ایک نظم کے اس حصے پر ہم قافیہ مصرعوں کی رو سے غور کیا جائے۔

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خوب ہی خوب میں بیدار نظر ہونے لگی
عدم آبادِ جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخیٔ دیر زمیں امروز کا زہر
دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دور کسی صبح کی تمہید لئے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
عدم آبادِ جدائی میں مسافر صورت
بے خبر گزری پریشانیٔ امید لئے

اور اسی تناظر میں اس صوتی غنائی ضابطے کی اتباعی شکل کو نشتر کی نظم ''وہ آرہی ہے'' کے اس اقتباس میں دیکھئے۔

شعاعِ رنگ ریز نے مسرتوں کے بادباں
اڑا دیے ہیں چار سو
انیک رنگ موئی گلال سا بکھر گیا
جمال صبح کی نمو سے آسماں نکھر گیا
گلابیاں سی چھوٹ کر
زمیں کی سمت ہے رواں

عجب خرام ناز ہے
خمار نشہ طلوع صبح نیم باز ہے
نشے میں چور کارواں
زمیں کی سمت ہے رواں !

آگے چل کر اگر ماہرین تنقید نے عبدالرحیم نشتر کی شاعری پر کما حقہ توجہ مبذول کی تو یقیناً ان کی شاعری کے کئی اظہاری و معنوی پہلو اور بھی روشن ہوں گے مگر احقر کے ادنیٰ خیال میں ان کے کلام میں متنوع موضوعات کے تحت جمالیاتی برتاؤ پر اصرار اور صوتی آہنگ کے استقرار کے وصف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

(۴ر جنوری ۲۰۰۷ء)

☆☆☆

اعتبارِ نیست صائب طائرِ اقبال را
ایں کبوتر پرزماں مشتاقِ بامِ دیگراست

اسیرِ جنگ

جیل کی سلاخوں سے
گاؤں دیکھ لیتا ہوں
ڈوبتی ابھرتی شام
روز روز مرتی شام
اور سب کی ہونٹوں پر میرا ٹوٹتا اک نام
تم تمہاری آنکھوں میں
ڈوبتے ہوئے سائے
جیسے شام ہوتے ہی کالی رات آجائے
ایک وسوسہ بن کر ذہن میں سما جائے
کب رہا ہوگا میں
اور کب مرے بچے میرا پیار پائیں گے
کب تمہارے سینے کا ارتعاش کم ہوگا
اور جتنے قیدی ہیں
مشترک ہے سب کا غم
سب کی سوچ یکساں ہے
جانے ریڈیو پر ہم کس طرح یہ کہتے ہیں
ہم بھی مزے میں ہیں، خیریت سے رہتے ہیں

☆☆☆

تتلی

کدھر سے گری میرے شانوں پہ آ کر
مرے کوٹ کے پھول پر جھلملائی
مرا جسم اپنے پروں سے چھوا
میرے اطراف اڑتی پھری دیر تک
جی ہوا
میں اسے اپنے ہاتھوں میں بھر لوں
مگر وہ
مری دسترس سے پرے اڑ گئی
میں نے مدھم سروں میں پکارا اسے
دوسرے اور بھی جال پھینکے
کسی طرح اس کو جھپٹ ہی لیا

اور جب
مٹھی کھولی تو پوروں میں چھوٹے ہوئے رنگ تھے

جو
اسی لحہ نس نس میں چبھنے لگے تھے

☆☆☆

شعلۂ زخم

شام اجلے پروں کی قبا اوڑھ کر
پھر اسی اجڑے بجڑے کھنڈر کی طرف
کس لئے آ گئی
اس خرابے میں شورِ فغاں کے سوا
دوسری کوئی آواز زندہ نہیں
خندقِ درد میں ہے سکوتِ سخن
دھڑکنوں میں کوئی ساز زندہ نہیں
مہرباں کون ہے در صفِ دشمناں
زد پہ آ جاؤں تو کیسے چھوٹے گی جاں
چاروں جانب حصارِ ہوس خیمہ زن
الحذر الحذر الاماں الاماں
پھڑ پھڑاتے لبوں پر مسیحا نفس
نام آئے تو کیا نام جائے تو کیا
شعلۂ زخم سے ہوں منور تمام
شام آئے تو کیا شام جائے تو کیا

زندگی کے دلاسوں سے بہلائے گی
شام اجلے پروں کی قبا اوڑھ کر
پھر اسی اجڑے پجڑے کھنڈر کی طرف
گھومنے آ گئی

☆☆☆

عید جب بھی آتی ہے

تارکول کی سڑکیں دور تک پھراتی ہیں
چھوٹی چھوٹی گلیاں بھی شہر میں گھماتی ہیں

پیر چلتے رہتے ہیں ، درد جلتے رہتے ہیں
پیاسی پیاسی آنکھوں میں خواب پلتے رہتے ہیں

ہوٹلوں میں رکتا ہوں پیاس کچھ بجھاتا ہوں
پان کی دوکانوں سے سگرٹیں جلاتا ہوں

جگمگاتے چہروں سے روشنی چراتا ہوں
پھر نئی صداؤں کے پیچھے دوڑ جاتا ہوں

اور کچھ نہیں ہوتا روح کسمساتی ہے
مجھ میں کوئی روتا ہے عید جب بھی آتی ہے

☆☆☆

میری عید کا چاند

ڈوب گیا ہے میری عید کا چاند کہیں
میرے گھر میں اترا تھا
میں نے اس کو چوما تھا
چوم کے کتنا جھوما تھا
اس کی نرم شعائیں سارے گھر میں نور جگاتی تھیں
پاپا، گڈو اور منی کے چہروں کو چمکاتی تھیں
پاس پڑوس کے سارے بچے اس کو گود کھلاتے تھے
جب وہ رونے پر آتا تو کیا کیا نہ بہلاتے تھے
روتے روتے میرا من خود مسکانے لگتا تھا
اپنی غوں غاں غوں غاں کو وہ گیت بنانے لگتا تھا
اس کے دم سے سارے گھر میں
رونق تھی، تابانی تھی
گھر کیسا آباد ہوا تھا کیسی ''خود حیرانی'' تھی
میرا چاند تھا لیکن سب کی آنکھوں کا وہ تارا تھا

ہاتھوں ہاتھوں لیا جاتا تھا ایسا راج دلارا تھا

اک دن ''موت پری'' نے اس کو دیکھا تو للچائی وہ

اپنا اڑن کھٹولہ لے کر چپکے سے گھر آئی وہ

میرے چاند کو چوما تھا

چوم کے کتنا جھوما تھا

مجھ کو روتا چھوڑا تھا

ڈوب گیا ہے میری عید کا چاند کہیں !

یہ کون سا دیار ہے

ہوا بھی مشک بار تھی
فضا بھی سازگار تھی
نگاہ جس طرف اٹھی
قدم جدھر بھی لے چلے
بہار ہی بہار تھی
زمیں لالہ زار تھی

طیور جھومتے اٹھے
ہر ایک درخت و شاخ پر
کہیں کسی منڈیر پر
کہیں کسی کے بام پر

پرندے اپنے غول میں پروں کو تول کر
نکل پڑے تھے آشیاں کی سمت ڈول ڈول کر

وہ سیر کر کے آچکے تھے اک نئے جہان کی
اڑا رہی تھیں آرزوئیں اب انہیں مکان کی
پلٹ رہے تھے گھر کو اپنے خوش نوائیاں لئے ہوئے
ہر ایک غول شادماں تھا کج ادائیاں لئے

نجانے پھر یہ کیا ہوا
پرند سب بکھر گئے
غبار میں اتر گئے
نگارِ شام کھو گئی
دھوئیں میں غرق ہو گئی

ہوا ہے زہر آفریں
فضا بھی ناگوار ہے
"یہ کیا جگہ ہے دوستو!
یہ کون سا دیار ہے"

☆☆☆

وہی سوکھا ہوا موسم

نہیں، کچھ بھی نہیں بدلا
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
وہی چہرے، وہی آنکھیں
وہی لب مسکراتے ہیں
وہی آواز بجتی ہے
وہی لہجے کھنکتے ہیں
وہی ہے، رقصِ صہبا، موج مستی
ڈھول، تاشے، کیف و سرشاری
وہی سڑکوں پہ ہنگامے
وہی کوچے چہکتے ہیں
وہی رنگوں کی پچکاری
سفید و صاف اور شفاف پیکر
اپنے ملکوتی لبادے جگمگاتے ہیں

.......ادھر ابلیس زادے
ناچتے ہیں، کودتے ہیں، کھلکھلاتے ہیں
نہ وہ جیتے، نہ یہ ہارے
فتح کا جشن جاری ہے
سفید و زرد رنگوں سے
ہنسی میری اڑاتے ہیں
کہ میں پھر رہ گیا اس بار بھی سوکھا ہوا موسم
مجھے پھر بیقراری ہے سوال رستگاری ہے

☆☆☆

ہواؤں کا ہجوم

ہواؤں کا ہجوم ہے
سفید و زرد و نیلگوں ہوائیں
جن کی دھوم ہے

ہرے بھرے شجر کو نوچتی ہوئی
شریر و سنگ دل ہوا
فضائے سنگ سے اٹھی
ہر اک سڑک
ہر اک گلی
صدائے زہر آفریں
سماعتوں پہ بار ہے
ہرے شجر پہ وار ہے
سفید دودھیا سفید جیسا پیرہن
ہرے ہرے شجر کے
سرخ خوں سے داغدار ہے

امن و آشتی کے خول میں
منڈھی ہوئی ہوا

ہوائے زرد کی غلاظتوں سے
ہمکنار ہے

بلندیوں سے آشنا
بلندیوں کی راز داں
بلندیوں پہ
چھائے رہنے کی ہوس میں سرگرداں
کسی بھی سمت مڑ گئی
کسی بھی سمت جا پڑی
ہوائے زرد و نیلگوں کے رنگ کو چرا لیا
ہرے شجر کو جا لیا
بڑی ہی ہوشیار ہے

شریر و سنگدل ہوا
فضائے سنگ سے اٹھی
ہر اک سڑک ہر اک گلی
صدائے زہر آفریں
سماعتوں پہ بار ہے
ہرے شجر پہ وار ہے

☆☆☆

خاموش یلغار

میرے دل میں دھماکہ ہوا
اس کی آواز بھی صرف میں نے سنی
دل کی دیوار کے چیتھڑے اڑ گئے
میں نے دیکھا
یہ منظر فقط میری آنکھوں میں محفوظ ہے
تیورا کر گرا
جیسے کوئی پرانی شکستہ عمارت زمیں بوس ہو
کوئی دوڑا نہیں
کوئی چیخا نہیں
کوئی رویا نہیں
خانۂ دل میں ایسے ہی
کتنے دھماکے ہوا کرتے ہیں
جس کی آواز بھی کوئی سنتا نہیں
کانچ کے بکھرے ٹکڑوں کو چنتا نہیں
دل کی بستی پہ خاموش یلغار ہے

بہرے گونگے جہاں میں سناؤں کسے
شور برپا ہے
ہر دن
دھماکوں کی بوچھار ہے !

☆☆☆

دشتِ کربل وہی

کھل گیا پھر وہی دشتِ کرب و بلا
پھر حسینی قبیلے پہ یلغار ہے
پھر یزیدی عصا کر چمکنے لگے
پھر وہی ان کی شمشیرِ خونخوار ہے

پھر ہے دریاؤں کی شرمساری وہی
پھر وہی تشنگی چار سو خیمہ زن
قطرے قطرے پہ ہے پھر تسلط وہی
پھر نظر آرہا ہے یزیدی چلن

پھر وہی جلتی تپتی ہوئی زندگی
پھر شب و روز کی تابکاری وہی
پھر اسی بے بسی کی ردا کھل گئی
پھر اندھیروں کی ہے تاجداری وہی

اس اندھیرے سے پھوٹے گی تازہ کرن
تارِ ظلمات سارے بکھر جائیں گے
جگمگائے گی لو عزمِ شبیر کی
سب یزیدوں کے چہرے اتر جائیں گے

دیکھنا دم میں نقشہ بدل جائے گا
دیکھنا کرب کی رات ڈھل جائے گی
دیکھنا سنگِ باطل پگھل جائے گا
دیکھنا پھر یہ امت سنبھل جائے گی

دشتِ کربل میں جانیں لٹاتے چلو
نیزہ نیزہ سروں کو سجاتے چلو

☆☆☆

میری تقدیر

لیجیے پھر دھماکے ہوئے
پھر مرا نام پہلے لیا جائے گا
پھر مرا ہاتھ ثابت کیا جائے گا
کالے کپڑے میں چہرہ چھپا کر مرا
میڈیا کے حوالے کیا جائے گا
پھر بنائے گی دنیا نشانہ مجھے
پھر سے رسوا کرے گا زمانہ مجھے
پھر مجھے دیش دروہی کہا جائے گا
پھر سے مجھ پر شکنجہ کسا جائے گا
میری تاریخ و تہذیب سب رائیگاں
بھول جائیں گے سب میری قربانیاں
میں فقط چپ رہوں
ظلم سہتا رہوں
نذرِ زنداں رہوں
مجھ کو حقِ تحفظ نہیں ہے کوئی

مار کھاتا رہوں
منہ سے اف نہ کروں
ان کا قانون ہے ان کی تعزیر ہے
قید رہنا فقط میری تقدیر ہے

☆☆☆

شہادت چاند سے روشن رہے

مقدس سر زمیں کو کافروں نے گھیر رکھا ہے
زمین و آسماں سب پر سیہی کی حکومت ہے
گرجتے بادلوں سے گونجتے ہیں جاں کے سناٹے
دیارِ نور میں پھیلی ہوئی پر نور ظلمت ہے

اسی پر نور ظلمت نے بصارت چھین رکھی ہے
کہ آنکھیں تو چمکتی ہیں نظر کچھ بھی نہیں آتا
طوافِ کعبہ کرتے ہیں جھکاتے ہیں سروں کو بھی
نجانے کیوں مقدر میں مگر کچھ بھی نہیں آتا

مگر کچھ لوگ تیرے دشت میں اب بھی بھٹکتے ہیں
وہی جوشِ جنوں ان کا وہی دیوانگی ان کی
کجھوروں کے درختوں سے لپٹ کر عزم کرتے ہیں
یہ کس مقتل کی جانب لے چلی فرزانگی ان کو

دھماکہ ہوگا خاک وخوں میں رل جائیں گے یہ پیکر
اجالا پھیل جائے گا زمیں پر شمعِ ایماں کا
یہی اک جاں فروشی عید نظارہ دکھائے گی
شہادت چاند سے روشن رہے موسم زمستاں کا

جنگل

یہ خطرناک، گھنیرا جنگل
تیرہ و تار، پر اسرار
دھواں اور غبار
سر پہ اوڑھے ہوئے
خاموش درختوں کی قطار
کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے یہاں آر سے پار
دن بھی تاریک ہے، راتوں کی طرح
کچھ بجھائی نہیں دیتا
طلسمی سنسار !
دودھیا، زرد شعاعوں کا ہجوم
شاخ در شاخ
چمکتا ہوا انبوہِ ہجوم
غول در غول بکھرتا ہوا
شیرازۂ بوم !
کچھ جھماکے سے ہوا کرتے ہیں
کچھ دھماکے سے ہوا کرتے ہیں
پھیل جاتے ہیں لہو کے دھبے
پھڑپھڑاتے ہیں پرندوں کے پرے

احمریں تیرگی
چھا جاتی ہیں چاروں جانب
اس اندھیرے سے
کوئی کیسے نکل پائے گا
ٹوٹتا کب ہے یہ دہشت کا حصار
سارا جنگل ہے سیاست کا شکار
کئی صدیوں کا سنہرا جنگل
کھو گیا ہے کسی تاریکی میں
اب تو جس سمت نظر جاتی ہے
آپ ہی آپ ٹھٹھر جاتی ہے

یہ خطرناک، گھنیرا جنگل
تیرہ و تار، پراسرار
دھواں اور غبار !

کھو گیا ایک سنہرا جنگل
میرا اماتوس بجیلا جنگل

کھلونے

کھلونا گھر میں ہزاروں طرح کے چہرے ہیں
مگر کبھی تو یہ کم بخت دل بہل جائے
کہیں تو خواب کا پیکر دکھائی دے مجھ کو
کبھی تو وقتِ گریزاں مجھے بدل جائے

یہ لمحہ لمحہ گزرتی لہو چشیدہ حیات
تمہاری یاد کا چہرہ تو بن نہیں سکتی
یہ شام شامِ تمنا تو بن سکے شاید
ہمارے غم کا مداوا تو بن نہیں سکتی

یہ داغ داغ اجالا یہ زخم زخم چراغ
یہ شام لائی ہے دامن میں کیسی سوغاتیں
نظر ملول ، معطل حواس ، دل مانوس
قبول کرنی پڑی ہم کو ایسی سوغاتیں

کہاں سنبھال کے رکھیں تمہاری یادوں کو
دل و نگاہ دریدہ ہیں ایسی ساعت ہے
کہاں سجائیں گے اپنی جواں مرادوں کو
دعائیں ہم سے کشیدہ ہیں ایسی ساعت ہے

غمِ حبیب ابھی دل سے مٹ نہ پایا تھا
کہ زندگی نے بھی چرکا لگا کے چھوڑ دیا
پڑے تھے راہ میں گرد و غبار کی صورت
ہوا کے جھونکے نے اونچا اڑا کے چھوڑ دیا

ہوا کہ جس کا نہیں اعتبار ہی کوئی
کبھی رفیق کبھی غم نواز ہوتی ہے
کبھی لٹاتی ہے خوشبوئے جسمِ یار مگر
کبھی بے وجہ ستم کا جواز ہوتی ہے

ہوا کو جس نے بنایا ہے وہ مرا خالق
عجیب کھیل دکھاتا ہے ہنسنے رونے کا
ذرا سی بات پہ کچھ یوں وہ توڑ دیتا ہے
کہ جیسے دل نہیں ہوتا کسی کھلونے کا

ہم اس تماشہ گہہ آب و گل میں ہیں نشتر
بساط اپنی کھلونوں سے کچھ زیادہ نہیں
بچے ہوئے ہیں مہرباں ہے یہ ہوا جب تک
بکھر گئی جو یہ مٹی تو لب کشادہ نہیں

یہ خاک خاک میں رولے گی خاکساروں کو
کہ اب ہوا بھی مسیحا تو بن نہیں سکتی
یہ لمحہ لمحہ گزرتی لہو چشیدہ حیات
تمہاری یاد کا چہرہ تو بن نہیں سکتی

ماں کی یاد میں

جانے کون بچاری تھی وہ
جس کی کوکھ سے
مجھ جیسا پاپی جنما........!
اپنے پاپ کے شعلوں میں خود جھلس رہا ہوں
مرے گناہوں کے دوزخ میں
وہ عورت بھی سلگ رہی ہے
وہ بچاری
جو مجھ ناہنجاز کی ماں تھی

☆☆☆

ہمارا المیہ

پاؤں تو تمتماتی ہوئی ریت میں دفن ہیں
اور خواب اپنا مقدر نہیں......!
اپنی آنکھیں سمندر پہ ہیں
پیاس بھی
جس کے پانی سے بجھتی نہیں
جو ہمیں
جو ہمیں غرق بھی ہونے دیتا نہیں

☆☆☆

جھوٹا سبق

مجھے بھی پڑھایا گیا تھا
ہوا زندگی ہے
بغیر ہوا سانس لینا بھی مشکل
مگر..........
تم اے بنتِ صبا اس کی تردید کردو
کہ میں تو
ابھی تک تمہارے بنا جی رہا ہوں

☆☆☆

میں چلا جاؤں گا

پھر یہ کاغذ ہوا میں بکھر جائیں گے
میں چلا جاؤں گا لفظ مر جائیں گے

برف کے پھول ہیں یہ اٹھا لو انہیں
اپنی آنکھوں سے دل سے لگا لو انہیں
جیب و دامن پہ اپنے سجا لو انہیں
ورنہ بکھرے تو جانے کدھر جائیں گے
میں چلا جاؤں گا لفظ مر جائیں گے

اچھی ضد ہے کہ یہ زندگی چھوڑ دو
زندگی بخش یہ نغمگی چھوڑ دو
مجھ سے کہتی ہو تم شاعری چھوڑ دو
تم کو ڈر ہے یہ قصے ابھر جائیں گے
میں چلا جاؤں گا لفظ مر جائیں گے

کیوں پریشاں ہو اک اجنبی کے لئے
کیوں ترستی ہو ایسی خوشی کے لئے
روگ بن جائے جو زندگی کے لئے
آنسو بن کر ستارے بکھر جائیں گے
میں چلا جاؤں گا لفظ مر جائیں گے

پھر نہ دیکھو گی ہنستی ہوئی چاندنی
جسم و جاں میں اترتی ہوئی چاندنی
روح کو شانت کرتی ہوئی چاندنی
یہ درخشندہ لمحے گزر جائیں گے
میں چلا جاؤں گا لفظ مر جائیں گے

ضرورت

وہ اپنا جسم تو ویسے مجھے چھونے نہیں دیتی
نگاہوں کو شرارت کی مگر پوری اجازت ہے
میں اس کو دور سے چاہوں نہاروں پاس رہ کر بھی
کبھی آنکھوں میں غصہ ہے نہ ہونٹوں پہ شکایت ہے

نئے دن کی طرح وہ بھی نیا چولا بدلتی ہے
مگر تیور وہی ، آنکھیں وہی ، صورت وہی اس کی
دلوں کو جیت لینے کی مہارت خوب ہے اس میں
کھلونے توڑ دینے کی مگر عادت وہی اس کی

بڑی سیدھی بڑی سادہ بڑی پرکار عورت ہے
اسے مجھ سے نہیں ہر کار آمد سے محبت ہے
میرے اسٹاف کی رونق بھی ہے وہ زندگی بھی وہ
شریکِ زندگی ہی کی نہیں سب کی ضرورت ہے

ذرا سی بدگمانی

بہت نزدیک ہے لیکن
ذرا سی بدگمانی
میلوں لمبا فاصلہ بن کر
ہمارے بیچ حائل ہے
وہی بھیگا ہوا موسم
وہی ٹھنڈی ہوائیں ہیں
وہی ہے صبح روح افزاء
بدن بھی جگمگاتے ہیں
مگر احساس گھائل ہے
نہ میں اس کی طرف دیکھوں
نہ وہ میرے لئے سوچے
نہ آنکھیں کھل کے روتی ہیں
نہ دل پوری طرح تڑپے
ندی کے دو کناروں کی طرح خاموش رہتے ہیں
ذرا سی بدگمانی کا ستم دونوں ہی سہتے ہیں

☆☆☆

آسماں پر چمکتی ہوئی کہکشاں

مجھ کو آواز دے کر کہاں چھپ گئی
آسماں پر چمکتی ہوئی کہکشاں
میری آنکھوں سے کیسے ستارے گرے
میرے دل میں یہ کیسا کھلا آسماں
کیسے چنگھاڑتے ابر لہرا گئے
کیسی گرنے چمکنے لگی بجلیاں
موسلا دھار برسات ہونے لگی
پھر شرابور ہونے لگے جسم و جاں
کس طرح پاؤں میرے اکھڑنے لگے
کس طرف لے چلا مجھ کو سیلِ رواں
میں تو نکلا تھا گھر سے اسے دیکھنے
مجھ کو آواز دے کر کہاں چھپ گئی
آسماں پر چمکتی ہوئی کہکشاں

☆☆☆

یہ چھیڑ کرتی ہوا

صبح سرما کی یہ چھیڑ کرتی ہوا
میرے کمرے میں چپکے سے در آئی ہے
اپنے یخ بستہ ہونٹوں سے
چھو کر مجھے
شبنمی گھاس پر
ننگے پیروں سے چلنے میں ہوتی ہے جو گدگدی
کچھ اسی طرح کا وہ مزہ دے گئی
جیسے اچھی سی کوئی خبر لائی ہے
صبح سرما کی یہ چھیڑ کرتی ہوا
میرے کمرے میں چپکے سے در آئی ہے

☆☆☆

دوسرا آدمی

بکھر رہا ہوں میں
سگریٹ کی دھوئیں کی طرح
ہوا کے دوش پہ
میرے وجود کا لہرا
نجانے
کس کے تجسس میں اڑتا پھرتا ہے
وہ کون ہے
وہ کہاں ہے
جو میری ہستی میں
پکارتا ہے مجھے
اور نظر نہیں آتا

☆☆☆

عروسِ اجل

کیا سنہرا غبار ہے تیرا
دیر سے انتظار ہے تیرا

موسموں سے نہارتا ہوں تجھے
ہر دشا میں پکارتا ہوں تجھے

تیرے رنگوں کو بھر کے بیٹھا ہوں
رت جگوں کو سمیٹے بیٹھا ہوں

صبح کی زرنگار کرنوں میں
شام کے حسن بار لمحوں میں

دوپہر کی جھلستی دھوپ لئے
اپنی آنکھوں میں تیرا روپ لئے

انجمن ہو یا کنجِ تنہائی
بے سکونی تجھے پکار آئی

پیڑ حسرت سے دیکھتے ہیں مجھے
پھول پنچھی ٹٹولتے ہیں مجھے

دل میں پلتی رہی جہاں کی ہوس
لب و رخسار گل رخاں کی ہوس

ہر طرف زندگی کا میلا ہے
کیا کہوں دل مگر اکیلا ہے

کون اپنا ہے اس زمانے میں
کون اترے غریب خانے میں

زندگی سے بہت نباہ کیا
ایک اک سانس کو تباہ کیا

اور کتنے غموں کو سہنا ہے
کفِ افسوس ملتے رہنا ہے

کھل رہی ہے ردا زمستاں کی
صبح روشن ہو حسنِ جاناں کی

میری تکمیل کا نشاں ہے تو
اے عروسِ اجل کہاں ہے تو

تیرے چہرے کی دید ہو جائے
تو جو آئے تو عید ہو جائے

ریٹائرمنٹ

شاخ سے اک ایک پتہ ٹوٹتا ہے
باغ سے اک ایک پنچھی چھوٹتا ہے
تیز ہیں ٹھنڈی ہوئیں
سنساتی ہیں بدن میں
منجمد ہوتی رگوں میں
زندگی خاموش ہوتی جارہی ہے
ہر خوشی روپوش ہوتی جارہی ہے
کنجِ تنہائی میں کہرا اوڑھ کے
بیٹھی ہوئی صبح زمستاں
دور تک پھیلا ہوا
ٹھٹھرا ہوا سا آسماں
پوچھتے ہیں: "کیوں مری جاں
دھوپ تو کمھلا گئی ہے
اب ٹھٹھرتا جسم لیکر پڑ رہو
زرد پتہ بن چکے ہو سڑ رہو"
اور کب تک دھوپ کا رستہ تکو گے
شاخ سے اک ایک پتہ ٹوٹتا ہے
سوکھے پتوں کی یہی تقدیر ہے

☆☆☆

رات

یہ شب میری ماں جیسی ہے
نیند میری آنکھوں میں رکھ کر
میٹھے میٹھے خواب دکھائے
دور دیس کی سیر کرائے
نئی نئی پریوں سے ملائے
دن بھر کا دکھ درد مٹائے
اپنوں سے، بیگانوں سے
دن کے سب افسانوں سے
مجھ کو دور اڑا لے جائے
ممتا کا آنچل پھیلائے
مجھ کو جزِ جاں جیسی ہے
یہ شب میری ماں جیسی ہے

☆☆☆

ایک نظم

کسی منزل کا تعین بھی نہیں
کوئی رستہ بھی نہیں آنکھوں میں
ہر طرف دھول، دھواں، گرد، غبار
ایک سپنا بھی نہیں آنکھوں میں
اب اندھیرے میں سفر کرنا ہے
زندگی لطف بنے قہر بنے
ہر طرح ہم کو بسر کرنا ہے

☆☆☆

رات بے درد ہے

نیند آنکھوں میں اترتی ہی نہیں
چپ ہے آکاش
زمیں چپ ہے
ہوا ساکت ہے
چاروں اطراف ہے گمبھیر، پراسرار سکوت
یہ فضا سرد ہے اب
خوں میں مچلتی ہی نہیں

رات بیدرد ہے
ٹلتی ہی نہیں

☆☆☆

ایک نظم

مرے امی ابا
کسی آٹھویں پاس لڑکی کو میرے لئے کس طرح مانگ لیتے
انہیں تو
کسی اچھے گھر کی، پڑھی لکھی اور "چاند جیسی بہو" کی
ہوس تھی
انہیں تو یقیں تھا
کہ میں ایم اے ہو کر
کم از کم پروفیسروں کی تو صف میں رہوں گا
مگر اب مرا کوئی سپنا سلامت رہا ہے
نہ ہی امی ابا کا کوئی یقیں
اور اب میں اسے
سرخ جوڑے میں
اور خود کو
فرسودگی کے جہنم میں
جلتا ہوا پا رہا ہوں

☆☆☆

جبر بھی ضروری ہے

چاروں جانب تیز ہوا ہے
گونج رہا ہے شور
کاغذ کا کیا زور
پیپر ویٹ کا بوجھ بھی اک احسان ہے
ورنہ
کاغذ دور کہیں اڑ جائے
تیز ہواؤں کے جھکڑ میں
آئے اور مڑ جائے
پرزہ پرزہ ہو تو کس اپیوگ کا رہنے پائے
ثابت ہو تو شاید کوئی چمک اٹھے تحریر
ممکن ہے
بن جائے ہنستی گاتی ایک تصویر

☆☆☆

قصیدہ

خدا کی زمیں پر
ہواؤں کے دم سے بڑی زندگی ہے
ہوائیں نہ ہوں تو.......؟
..................!
....!!
..............................!!!
میں ہواؤں کا ممنونِ احسان و اکرام ہو
میرا احساس بھی جو اڑا لے گئیں
میرے جذبات بھی جو بہا لے گئیں
اب تو بس
بے حسی کی سیہ ریت پر
اپنی بکھری ہوئی لاش تکتا رہوں
اور بنتِ صبا کا قصیدہ پڑھوں

☆☆☆

ایک نئے گھر میں

ستھرا آنگن
صاف چمکیلی دیواریں
دیواروں پر
رنگ برنگے
نئے نویلے
دلکش کیلنڈر آویزاں
لگتا ہے رہتی ہے لڑکی
کوئی سلیقہ مند یہاں

☆☆☆

تم کہاں ہو

چاند گہنا ہو گیا
تارے دھندلا گئے
اور اندھیرا اندھیرا زمیں ہو گئی
راستے ایک اجانی سیاہی میں گم ہو گئے
ہاتھ کو ہاتھ تک بھی سجھائی نہ دینے لگا
صورتیں آشنائی کی عینک سے باہر ہوئیں
ہر طرف ایک پراسرار، پر ہول سناٹا چھانے لگا
رفتہ رفتہ کوئی خوف سا میرے اندر سمانے لگا
میں اکیلا ہوں
مجھ کو یہ احساس کھانے لگا
تم کہاں ہو
گئی رات کے ہمرائیو
کیا تمہیں بھی یہی صورتِ حال درپیش ہے؟

☆☆☆

ایک نظم

میری شہوانیت اب کہاں سوگئی
پہلے جیسا یہ دل کیوں مچلتا نہیں
اب بدن میں لہو کیوں اچھلتا نہیں
کیوں رگ و پے میں وہ موجِ آتش نہیں
چاہنے، چاہے جانے کی چاہت نہیں
اس کے پہلو میں رہ کر بھی کیوں سرد ہوں
آج برگِ خزاں کی طرح زرد ہوں
کیا ہوا ہے کہ یوں جسم گونگا ہوا
خوئے مردانگی بھی دھواں ہوگئی
میری شہوانیت اب کہاں سوگئی

☆☆☆

ندی ماں

میں تری گود میں کھیلا ہوا نٹ کھٹ بالک
اپنی نوخیز نوجوانی کو ترستا دیکھو
قلب شاداب کو
صحرائے تمنا میں جھلستا پاؤں
کوئی خورشید کرن
کوئی ہوا کا جھونکا
میرا دم ساز نہیں
رنگ، خوشبو و ملاحت مرے بالے پن کی
تیرے سینے میں چھپی ہوگی کہیں
کب سے میں آکے کھڑا ہوں
تیری بانہوں کے قریں
اٹھتی گرتی ہوئی موجیں مری جانب کردے
اپنے سینے سے لگالے مجھ کو
اپنے آنچل میں چھپالے مجھ کو

☆☆☆

نیا سال... پرانے زخم

کنارِ شرق سے اتری
دو شالہ پہن کر گوری
شعاعوں نے لپک کر چار سو پیغام پہنچایا
ہواؤں نے لہک کر غنچہ غنچہ جام پہنچایا
فضا بے ہوش سی کیوں ہے
دھرا خاموش سی کیوں ہے
کھڑے ہیں اونچے اونچے کالے پربت برچھیاں تانے
ہجومِ بیکساں کس کو سنائے اپنے افسانے
وہی ویرانیاں قائم
وہی ارزانیاں قائم
ہزاروں سال بیتے، جانے کتنے سال جائیں گے
نئے سورج اٹھیں گے پھر نئے قصے سنائیں گے
وہی غم کی روانی ہے
وہی چپتا پرانی ہے

☆☆☆

تجویز

........تو ایسا کریں
ان ہواؤں کے سینے میں سب درد بھر دیں
وہ ہر درد
جو زہر ہے
اور ہماری رگوں کا لہو بن گیا ہے
کہ یہ زہر پی کر ہوائیں
یہاں سے وہاں سر پٹکتی پھریں
اور ہم تم سمجھ لیں
کہ اندر سے
اک دوسرے کے دلوں میں
وہی خواہشیں ہیں
وہی خواب ہیں
جن کی ترسیل و تعبیر پر
چند ضدی دماغوں کی بندش لگی ہے

☆☆☆

مرے حریفو! سنو

ہمارے خون کی سرخی تمہارے چہروں پر
دبیز ہوتی چلی جارہی ہے روز بروز
بہت ہی نازاں ہو
شاداں ہو
اپنی قسمت پر
مگر یہ خون ہے گرتا ہے جمنے لگتا ہے
پھراس کی سرخی سیاہی میں ڈوب جاتی ہے
مرے حریفو! سنو
ہر گھنے اندھیرے سے
نئی شعاعیں تڑپ کر نکل ہی آتی ہے
نئی شعاؤں سے اطراف جگمگاتے ہیں
اندھیرے
اپنے ہی دامن میں ڈوب جاتے ہیں
ہلال عید اندھیرے میں کھو نہیں سکتا
ہماری عید نہ ہو
یہ تو ہو نہیں سکتا

☆☆☆

شناخت

اپنی جیسی کئی سرد لاشوں کی پہچان ہوں
میں تیری زرد آنکھوں کی میزان ہوں
میرا اسو کھا بدن، میری روکھی زباں
میری پھیکی نظر، میرا کچا بیاں
کالی سڑکوں پہ نکھری ہوئی چاندنی
میری آنکھیں دھواں
بستروں میں ہیں سب
اور میں بے مکاں
بلڈنگوں کا فلک بوس یہ سلسلہ
اور فرشِ زمیں پر تڑپتا ہوا
میں بے ننگ و نام و نشاں
غم زدہ، نیم کشتہ
سسکتے ہوئے دل کا ارمان ہوں
اپنی جیسی کئی سرد لاشوں کی پہچان ہوں

☆☆☆

مہرباں رات مری ماں جیسی

بھیگی ہوئی چاندنی رات
شبنم کے قطروں کے زرتار ملبوس میں
ایک شائستہ آہستگی سے
میرے دل میں اتری تو ایسا لگا
یہ سراپا اجالوں کا مخرج ہوا
اچانک کہیں سے
ہواؤں کا اک سرد جھونکا
تھرکتا ہوا
جسم سے آلگا
ایک پل کو یہ محسوس ہونے لگا
یہ سراپا
انجانی مٹھاسوں کا
شاداب
شیتل
اداسی میں تحلیل ہونے لگا

ابھی میرے پیکر سے
نکلے گا سایہ کوئی
اور اس شبنمی، چاندنی رات کا انگ ہو جائے گا
نور بن جائے گا
رنگ بن جائے گا
اور جب صبح ہوگی
تو سورج کی جلتی ہوئی
تیز کرنوں میں بھیگی ہوئی
چاندنی رات کی شبنمی کیفیت
مجھ سے چھن جائے گا
اور جلتے ہوئے دن کی حدت زدہ دھول
میرے مقدر کے
ویراں کھنڈر میں اڑے گی
خدا! اے خدا!
آج کی اس زمستاں کی شب کو
کہ جو
ممتا بن کے پھیلی ہوئی ہے
یہیں روک لے
خدا! اے خدا!

☆☆☆

اپنی کہانی

اگر سن سکو میرے غم کی کہانی
تو پردیس سے آنے والی ہواؤں سے پوچھو
یخ بستہ کیوں ہیں
انہیں کیوں حرارت نے محروم رکھا
سیہ، سرد راتوں کا مقسوم رکھا
وہ کیوں سر بریدہ
پریشاں بھٹکتی ہیں
بے چین روحوں کی کالی زمیں پر
جہاں چلتی پھرتی ہوئی زندہ لاشیں
عداوت
رقابت
تعصب کے گہرے اندھیرے میں
دل کا سکوں ڈھونڈتی ہیں
مگر نارسیدہ ہواؤں سی
حیراں، پریشاں

زمیں آسماں ایک کرتی ہوئی
یخ زدہ گھومتی ہیں
اگر اس ٹھٹھرتی ہوئی
شب کی بھیگی کہر میں
ذرا دیر ٹھہرو
اور چبھتی ہواؤں کے نیزوں کو
اپنا بدن سونپ دو
تو میں
تر بتر کیوں ہوں اپنے لہو میں
مرا درد کیا ہے
مرا درد کیوں ہے
یہ سب جان لوگے
اور میرے سراپا میں
ٹوٹا ہوا
کس کا پیکر ہے
پہچان لوگے

☆☆☆

تو میں نے دیکھا

رات کو جب
جسمِ خفتہ جاگ اٹھا
اور ہر ایک عضو کو
گویائی کی نعمت ملی
انگلیوں کے لمس کی
میٹھی حرارت نے اسے سرشار کر ڈالا
مجھے بھی
ٹھنڈی میٹھی آگ نے
نت نئی
نا آشنا لذت چکھا دی
سات رنگوں کی
دھنک کرنوں نے
لہراتا ہوا
دور تک
میں گم شدہ فردوس میں

اڑتا پھرا
ایک پل کو یوں لگا
زندگی کے سارے دکھ
محرومیاں
مایوسیاں
رات کے اس شبنمی کہرے میں
غلطیدہ ہوئے
صبح جب کمرے میں
جلتی دھوپ نے رکھے قدم
تو میں نے دیکھا
فرش پر سب کرچیاں بکھری پڑی ہیں
اور
مرا عکاس شیشہ ہی نہیں
میں خود بھی
چورا چور ٹکڑوں میں پڑا ہوں

☆☆☆

سانس تابندہ ہے

اس گلی میں بڑی دیر تک میں ادھر سے ادھر آتا جاتا رہا
اپنے اطراف کی بھیڑ سے بے خبر
آتی جاتی سواری کی آواز سے بے تعلق
کبھی کھڑکیوں میں
کبھی تنگ وتاریک زینوں پہ
پیاسی نظر.......ایک بھوکے گداگر کی صورت بھٹکتی رہی
اور اک پھانس سی کوئی شئے
میرے دل میں کھٹکتی رہی
اک اجنا سا ڈر ذہن میں سر اٹھانے لگا
میری بیوی.......مجھے ٹوٹ کر چاہنے والی بیوی ؛
نہیں.......میں نہیں جاؤں گا
لوٹ جاؤں گا گھر
اس وفادار، پیارے بدن سے دغا کیا کروں
جس کی ہر کندنی لمس
میری ہر رات

ہر لمحہ
ہر سانس تابندہ ہے
اس کا مردہ بدن
خاک میں دفن ہے
وہ ابھی تک
مرے جسم میں زندہ ہے
کچھ یہی سوچ کر
اس گلی میں بڑی دیر تک......

☆☆☆

اللہ! جو یوں کروں تو!

اک اجنبی مکاں میں
بیٹھا ہوا ادب سے
ابو سے گفتگو میں
کھویا ہوا ہوں کب سے
اتنا نہیں کہ آنکھیں
دیوار و در کو تاکیں
دہلیز کو پھلانگیں
پردے کے پیچھے جھانکیں
دیوار سے لگی میں
کب تک کھڑی رہوں گی
دروازے کو ہلاؤں
یا چوڑیاں بجاؤں
امی ہنسیں گی مجھ پر
ابو خفا رہیں گے
اللہ! جو یوں کروں تو
وہ خود بھی کیا کہیں گے

☆☆☆

پاداش

فرشتو! ذرا دیر تو ٹھہر جاتے
ابھی اس نے آنکھیں بھی کھولیں نہ تھیں
کوئی آواز منہ سے نکالی نہ تھی
ماں سے الجھا نہ تھا، مجھ سے روٹھا نہ تھا
ماں نے ڈانٹا نہ تھا، میں نے پیٹا نہ تھا
تم اسے دودھیا بادلوں میں چھپا کر
کہاں لے چلے ہو
کہ اس نے ابھی
میری دنیا کی آلودگی، اور آلودگی سے بھری زندگی
اپنی آنکھوں سے دیکھی نہ تھی
زندگی دیکھنا، زندگی جھیلنا
اس کی تقدیر میں تم نے لکھا نہ تھا
پھر اسے کیوں مرے گھر میں لے آئے تھے
کیوں مجھے نت نئے خواب دکھلائے تھے
اس کی ماں

جس کی آنکھوں میں خوابوں کی نہریں رواں تھیں
وہاں اب فقط آنسوؤں کے کنویں ہیں
جنہیں دیکھ کر بھیگ جاتا ہوں میں
پھر بھی کیوں دور تک
اپنے اندر سلگتی ہوئی ریت کا دشت پاتا ہوں میں
کیا یہ میرے گناہوں کی پاداش ہے؟
اے فرشتو! اسے تم کہاں لے چلے ہو
گنہگار میں ہوں تو مجھ کو سزا دو
ایک بھیگی ہوئی صبح
چاروں طرف موگرے اور بیلے کی خوشبو رواں
میرے اطراف شاداب پھلواریاں
پیڑ پودوں پہ مانوس گلکاریاں
میں چمن میں کھڑا ہوا
مگر میری آنکھیں دھواں
اک سیہ سوچ......یہ زندگی رائیگاں
اے فرشتو! اسے لے چلے تم کہاں؟

☆☆☆

کہاں گئے ہو غازیو!

کہاں گئے ہو غازیو!
صدا سنو
فضا میں کیسا شور ہے
ہوا میں کیسا زور ہے
یہ کون سنسنا گیا
رگوں میں منجمد لہو
'قیاس' تار تار ہے
شکستہ منظری کے رخ
نگاہ میں غبار ہے
سیاہ پروں کے کارواں
چھپے ہیں سوئے آسماں
زمین زرد زرد ہے
یقین فرد فرد ہے
کہاں گئے ہو غازیو!
صدا سنو

پکارتے ہیں سبز ہاتھ
تھمتماتے دشت سے
فرات کی طرف چلو
کہاں گئے ہو غازیو!
صدا سنو

دودھیا بادلوں کی سواری

دودھیا بادلوں کے پرے کے پرے
چاروں جانب سے اڑ اڑ کے آنے لگے
سبز و شاداب پیڑوں پہ ہنستی ہوئیں
نرم و نازک ہری پتیاں جھوم اٹھیں
ننھے منے پرندوں کی چہکار سے
منظروں پہ نئے رنگ پڑنے لگے
ہر طرف سبز و شاداب پھلواریاں
موسم رنگ و بو کی فسوں کاریاں
آسماں سے فرشتے اترتے ہوئے
میری دھرتی کو پرنور کرتے ہوئے
مخملیں سبز پوشاک پہنے ہوئے
سرمئی کوہساروں کی آغوش سے
صاف و شفاف جھرنوں سے بہتے ہوئے
موج در موج نیچے اترتے ہوئے

کیا خبر تھی کہ یوں بھی چلے آئیں گے
اور مجھے اپنے ہمراہ لے جائیں گے

کہہ دو آنسو بہائے نہ کوئی گلی
دودھیا بادلوں کی سواری چلی

☆☆☆

موت !

شب باراں کے اندھیروں کی
سیہ یکسوئی سے
وہ دبے پاؤں اچانک اتری
درودیوار کی ہنستی ہوئی رونق سے ملی
ایک اک چیز قرینے سے سجا رکھی تھی
زندگی میں نے سلیقے سے سجا رکھی تھی
ایک مضبوط سا
محفوظ سا، دلکش مسکن
کتنی ہی خواہشوں اور خوابوں سے آراستہ گھر
دل کو ہاتھوں سے دبائے ہوئے کھڑکی سے پرے
میں نے دیکھا تو زمیں آسماں سب میرے تھے
تب ہی جیسے کوئی دیوار مرے سر پہ گری!
مسکراتی ہوئی دزدیدہ نگاہی کو بچھائے ہوئے
دیکھا اس نے
وہ، جو تاریک لبادے میں لپیٹے خود کو

دھیرے دھیرے مرے نزدیک چلی آئی تھی
میرے پیروں پہ گری
سر کی طرف بڑھنے لگی
آسماں اب مرے ہاتھوں سے چھٹے جاتے ہیں
اب زمینیں مرے قدموں سے جدا ہوتی ہیں
بسترِ مرگ پہ بیمار نے اک ہچکی لی
شب کی تاریک ردا چاروں طرف پھیل گئی

☆☆☆

روزی اور موت

چاروں جانب شور مچا تھا
اک اک پرزہ بول رہا تھا
چیخ رہی تھی ساری مشینیں
میں اپنے میں گونج رہا تھا

بوڑھی ماں لاچار پتا جی
چھوٹے بھائی، ننھی بہنیں
بیوی بچے، سنگی، ساتھی
تھوڑے ارماں ڈھیری فکریں

کیا کیا خواب سجا رکھے تھے
کیا کیا آس لگا رکھی تھی
کسے پتا تھا؟ اس روزی نے
میری موت چھپا رکھی تھی

☆☆☆

مسافر چل رہا تھا

مسافر چل رہا تھا
چلتے چلتے تھک چکا تھا
مگر چلنا مقدر تھا
کہ منزل کا ابھی کوسوں کہیں کوئی نشاں نہ تھا
"چلو، چلتے رہو
جب تک تمہارے پاؤں نہ ٹوٹیں"
مرے قدموں سے روندی جا رہی راہیں یہ کہتی ہیں:
"چلو، چلتے رہو
جب تک تمہارے حوصلے چھوٹیں
کہ جب تک چل رہے ہو
منزلِ مقصود باقی ہے
جہاں رک جاؤ
پھر آگے بڑھنے کی سکت خود میں نہ پاؤ گے
سمجھ لینا مسافت ختم ہے
منزل پہ آ پہنچے!"

☆☆☆

وہ آرہی ہے !

حسین و دل نشیں و پر کشش
قبا میں زیبِ تن
چلی وہ سمت شرق سے
قدم قدم ہزار ہا گلِ شعاع کھل اٹھے
آسماں پہ دور تک
غبارِ نور کی جھلک
شعاعِ رنگ ریز نے مسرتوں کے بادباں
اڑا دیے ہیں چار سو
انیک رنگ سونی گلال سا بکھر گیا
جمالِ صبح کی نمو سے آسماں نکھر گیا
گلہریاں سی چھوٹ کر
زمیں کی سمت ہیں رواں
عجب خرامِ ناز ہے
خمارِ نشۂ طلوعِ صبح نیم باز ہے
نشے میں چور کارواں

زمیں کی سمت ہیں رواں !

وہ آ رہی ہے

پیکرِ حیات، روحِ کائنات

نئی لطافتوں، صباحتوں کے رنگ اوڑھ کر

تازہ منظروں سے

تازہ زندگی اچھال کر

اتر رہی ہے دھیرے دھیرے

ہر قدم سنبھال کر

ہوائیں جھومنے لگیں

شجر حجر نکھر گئے

نگاہ دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی

رنگ سے بکھر گئے

طیور گنگنا اٹھے

شگوفے مسکرا دیئے

سفید و سرخ و چمپئی

نیلے، پیلے، جامنی

سنہرے، سیمیں، شربتی

اٹھے بنفشئی و قرمزی

ارغوانی، سرمئی، زمرّدیں

زمیں کا سبز پیرہن دمک اٹھا

ہزار رنگ خوشبوؤں کا جام ہی چھلک اٹھا

میں نے ایک گھونٹ لی
لب بھی تر ہوئے نہ تھے
بہک گیا!
وہ آرہی ہے
اس کے خیر مقدمی جلوس میں
مکانِ جاں سے چل پڑوں
اجل نہیں، عروس ہے
اپنی بانہیں کھول کر
مجھے پکارتی ہے وہ
صدائے مہرباں سنوں
میں بس اسی کا ہو رہوں

☆☆☆

پرندے تو مسافر ہیں

طلوعِ صبحِ رحمت ہے
فرشتے دودھیا ملبوس پہنے
اپنی نورانی شعاؤں سے
زمیں کو گھیرتے جاتے ہیں
تا حدِ نظر
کھلتے ہوئے تازہ مناظر ہیں
اٹھی چہکار نغموں کی
پرندے اپنی شاخوں سے نئی پرواز بھرتے ہیں
فضا کو گرم کرتے ہیں
پرندے تو مسافر ہیں !

موذن کی صدا گونجی
وہ نورانی شعائیں
بند دروازوں کو تکتی ہیں
"اٹھو! زنجیر بجتی ہے

چلو! دستک بلاتی ہے
جو سوتے ہیں وہ کھوتے ہیں
جو کھوتے ہیں وہ روتے ہیں"

مجھے ایسا لگا
جیسے شعاعِ نور نے نہلا دیا مجھ کو
خلا میں اڑ رہا ہوں
پاک کرنوں کی سواری ہے
کئی انجان خوشبوئیں
میرے دامن سے لپٹی ہیں
زمیں پیچھے، زماں پیچھے
مکیں پیچھے، مکاں پیچھے

پرندے اپنے اپنے
آشیانوں کو پلٹتے ہیں
وہ اپنی شاخِ ہجرت سے
نئی پرواز بھرتے ہیں
فضا کو گرم کرتے ہیں
پرندے تو مسافر ہیں!

☆☆☆

سزا

تو کہ ہر چند گریزاں ہی رہا کرتی ہے
کب کسی چاہنے والے سے وفا کرتی ہے
اپنے مشتاق کو،
بیمار کو،
متوالے کو
باندھ لیتی ہے
سیاہ زلف کی زنجیروں سے
سار رکھتی ہے
اداؤں کے نئے
تیروں سے
جو ترے دام میں پھنس جائے
نکلتا ہی نہیں
تیری ٹھوکر میں جو آ جائے
سنبھلتا ہی نہیں
تو کہ ہر نفس سے پیمان وفا کرتی ہے

تیرا ہو جائے تو چپکے سے دغا کرتی ہے
میں تیری سانولی رنگت کا
سنہرا قیدی
اڑنا چاہوں تا کہاں جاؤں
کہ ٹھہرا قیدی
اپنے مشتاق کو
بیمار کو
متوالے کو
طولِ زنجیر تک آزاد رکھا کرتی ہے
کب کسی چاہنے والے سے وفا کرتی ہے
سوچتا ہوں
تری زلفوں سے رہا ہو جاؤں
زندگی!
میں بھی ترے حق میں
سزا ہو جاؤں

☆☆☆

محبت کا سفر ہے

محبت کا سفر ہے
دوستی کی راہ روشن ہے
ہزاروں خوشبوؤں کا قافلہ ہمراہ نکلا ہے
کہ جیسے قصرِ شاہی سے جلوسِ شاہ نکلا ہے
نگاہ منتظر کو چومنے کی آرزو لیکر
نواحِ یار میں وارفتگی کی،
جھومنے کی آرزو لیکر
قدم رنجہ ہوئے ہیں والہانہ شوق کی لے پر
عجب سی ایک سرشاری چھلکتی ہے
رگ پے پر
محبت کا سفر ہے!
گزرتے کھیت
ہنستے لہلاتے خوشنما منظر
سجل گاؤں، دمکتے شہر، پراسرار جنگل
رقص کرتیں، گنگناتیں شوخ ندیاں

خوش ادا پیکر
ترنم ریز ہیں پنچھی
شگوفے مسکراتے ہیں
صفِ اشجار ہیں تازہ مناظر جگمگاتے ہیں
ہوا نغمہ سناتی ہیں
فضا لہرائی جاتی ہیں
نظر بیتاب سی کوہسار و وادی میں بھٹکتی ہے
دھڑکتا ہے دلِ پرشوق
حسرت سر پٹکتی ہے
ادھر سے وہ بھی یونہی مست و بےخود ہو کے آ جائیں
کھلی باہوں میں بانہیں ڈال کر
اپنا بنا جائیں
زمین و آسماں دیکھیں
ترانے گنگنائیں
جھلملائیں
نور بن جائیں
محبت کا سفر ہے !

☆☆☆

سفید سوّر

سفید سوّر
غلاظتوں پر
لپک لپک کر
سنہرا فضلہ چبا رہے ہیں
بڑے مگن ہیں
بڑے سکوں سے
یہ اپنے نوکیلے، تیز دانتوں سے
لقمہ لقمہ اٹھا رہے ہیں
سنہرا فضلہ چبا رہے ہیں
صفِ سگاں کچھ بگاڑ پائی
نہ اڑتے کوّوں کی کائیں کائیں
یہ موٹے موٹے سفید سوّر
نگاہ رکھتے ہیں دائیں بائیں
کہ تیز دانتوں سے ناخنوں سے
کسی بھی حیوان کو پھاڑ کھائیں

شریر کتے، غصیلے کوے بھی ہراساں
کبھی ہراساں، کبھی پریشاں
کبھی تماشائی بن گئے ہیں
اگر یہ سؤر، غلاظتوں پر، لپک لپک کر
اسی طرح دانت تیز کر لیں
تو کل یہ بستی......... یہ ساری بستی
جو آج محفوظ و بے اثر ہے
سفید سؤر کی خصلتوں سے بھی بے خبر ہے
یہ کل نیا چارہ بن نہ جائے
تماشا کیا دیکھتے ہو، آؤ
انہیں پکڑ لو، انہیں گراؤ
انہیں سلاخوں میں بند کر لو
تنی ہوئی توند چیر ڈالو
سفید سؤر، غلاظتوں پر، لپک لپک کر
سنہرا فضلہ چبا رہے ہیں

☆☆☆

مجھے تو قتل ہونا ہے

مجھے تو قتل ہونا ہے
نظر جس سمت اٹھتی ہے
کھلا ہے کوچہٗ قاتل
وہی خنجر چمکتے ہیں
وہی آنکھیں دہکتی ہیں
وہی شعلے چمکتے ہیں
کسی کے ہاتھ چاندی ہے
کسی کے ہاتھ سونا ہے
مجھے تو قتل ہونا ہے
وہ کنجِ عافیت جو خواں بن کر جگمگاتا تھا
غبارِ حسرتِ تعبیر بن کر منہ چڑاتا ہے
کہیں اجڑی ہوئی گلیاں
کہیں بکھرا ہوا ملبہ
کہیں ٹوٹیں ہوئیں شاخیں
ادب، تہذیب،

تاریخِ تمدن خون روتے ہیں
کہیں مذہب،
کہیں مسلک،
کہیں کچھ اور دیواریں
مرے چارہ گروں کو قدرے آسانی میسر ہے
نئے نعروں،
نئے 'ہتھیار' لفظوں سے مزین ہیں
وہ میرے پاس آئیں گے
نئے قصے سنائیں گے
انہی پہ کان دھرنا ہے
انہیں دل میں سمونا ہے
مجھے تو قتل ہونا ہے!

☆☆☆

تعصب

اس قدر بھی خون میں شامل رہے گا
کیا پتہ تھا.........؟
مجھے اس نے
اسے میں نے
نظر کی ڈوریوں سے باندھ رکھا تھا
نئی سمتوں،
نئے گوشوں میں یک جہتی ابھرتی تھی
ملاقاتیں تھیں،
باتیں تھیں،
محبت دھیرے دھیرے
آشیانہ بنتی جاتی تھی
ہوائیں رقص کرتی تھیں
فضا نغمے سناتی تھی
مگر اک ہم وطن کی 'دل لگی' نے
سارے تنکے نوچ ڈالے

محبت
عصبیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا
چہرہ سجاتی ہے
مجھے نیچا دکھاتی ہے
کہ اب وہ
اپنی مٹی
اپنی دھرتی کی طرف
پینگیں بڑھاتی ہے
رفاقت،
ہجر کے صدمے اٹھاتی ہے
تعصب.......!
اس قدر بھی خون میں شامل رہے گا
کیا پتہ تھا........؟

☆☆☆

جاگیر

نجانے مجھے ایسا کیا ہو گیا
اس پرانی عمارت پہ نظریں پڑیں
اور میں کھو گیا
رنگ و روغن کی بوسیدگی بھی وہی
اینٹ مٹی کی فرسودگی بھی وہی
پھر بھی اک سوہنی روشنی
ایک تابندگی
جا بجا جگمگاتی ہوئی دلکشی!
جی ہوا اس کی دیوار سے جا لگوں
بس یہیں پڑ رہوں
کوئی سپنا بنوں
میں نے نظریں اٹھائیں
تو ایسا لگا
وہ عمارت صدا دے رہی ہے مجھے
اک نئے عہد کا

اک نئے جہد کا

واسطہ،

حوصلہ دے رہی ہے مجھے

دیر کیسی

چلوں، اور چل کے

بہاروں کا در وا کروں

دفعتاً......

ایک کھڑکی کھلی

ایک جھونکا اٹھا

مجھ پہ مٹی گری

اب تو آنکھوں میں دھندلی سی تصویر ہے

یہ عمارت کہاں میری جاگیر ہے؟

☆☆☆

نئے منظر چمکتے ہیں

زمین درد نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا
ہر اک عیش و مسرت
راحت و آرام نے منہ پھیر رکھا تھا
طلوع صبح سے
جاں سوز منظر رنگ بھرتے تھے
شعاعِ مہر سے سارے بدن میں آگ روشن تھی
ہوائیں تیز تھیں
آتش بداماں کس طرف جاتے
کہیں بھی
کوئی کنجِ عافیت محفوظ ہی کب تھا
صدا دیتے
کہاں فریاد کرتے
کون سی زنجیر چھنکاتے
جہانگیروں نے اپنی خواب گاہیں بند رکھی تھی
بے حس، سنگیں ایوانوں کی راہیں بند رکھی تھی

تو آؤ!

اس عذابی دھوپ ہی کو اوڑھ کر نکلیں

شعاعِ مہر کے شعلوں سے محوِ جنگ ہو جائیں

سبھی جلتے سلگتے منظروں کا انگ ہو جائیں

ہوا خاموش ہوتی ہے

کوئی شعلہ نہیں اٹھتا

نئے منظر چمکتے ہیں

چواب گل بداماں ہم کسی جانب نکلتے ہیں

زمینِ درد نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا

☆☆☆

میٹھی کٹاری

کھلی ہیں جتنی راہیں
سب مری دہلیز چھوتی ہیں
کوئی ہاتھی پہ آتا ہے
کوئی گھوڑے پہ استادہ
کوئی رتھ کی سواری پر
پیادے بھی قدم رنجہ ہیں
سب تشریف لاتے ہیں
مجھے اپنا سمجھتے ہیں
گلے سے بھی لگاتے ہیں
بڑی تسکین دیتے ہیں
مرے دل کو رجھاتے ہیں
یہ جتنے چارہ گر ہیں
سب مرے غم خوار ہیں
ہمدرد ہیں
سب کو مری چِنتا پڑی ہے

سب مرے غم مجھ پہ پریشاں ہیں
نجانے کیوں
میں ان چارہ گروں کی مان لیتا ہوں
نجانے کیوں
ہمیشہ میں انہی پہ جان دیتا ہوں
یہ پھر چپکے سے مجھ پر
مجھ پر ہی نئی یلغار کرتے ہیں
انوکھا وار کرتے ہیں
اسی میٹھی کٹاری سے ہمیشہ قتل ہوتا ہوں
کھلی ہیں جتنی راہیں
سب مری دہلیز چھوتی ہیں

☆☆☆

چارہ ساز

وہ دیوی بن گئی تھی
سب اسی سے رام رہتے تھے
اسی کی بارگاہِ عالیہ میں
سر بہ سجدہ
صبح و شام رہتے تھے
رسا اور نارسا سب ہی
پرستاروں میں شامل تھے
اسی نے سب کو گھائل کر رکھا تھا
اور سب اس کے ہی قائل تھے
وہ دیوی تھی کہ ڈائن تھی
نہیں کھلتا یہ راز اب تک
سمجھتے ہیں سارے پجاری
چارہ ساز اب تک
وہ عورت مر گئی جس دن
مجھے ایسا لگا

پژمردہ دھرتی مسکرائے گی
خزاں آلود چہرے پر گلابی لوٹ آئی گی
مگر یہ کیا......؟
مری دھرتی پہ دیوی پھر سے لوٹ آئی!
چٹورے، مفت خورے
سب پجاری رقص کرتے ہیں
نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں
وہ دیوی ہے کہ ڈائن ہے
نہیں کھلتا یہ راز اب بھی
سمجھ رکھا ہے بے چاروں نے اس کو
چارہ ساز اب بھی!

☆☆☆

صناعِ ازل کا انعام

تجھ کو دیکھا تو کئی پھول کھلے آنکھوں میں
یہ مہکتا ہوا شاداب گلابی پیکر
ایک خوشبو سی اڑی جاتی ہے رستہ رستہ
دورسے نکہت ورامش کی شعاعوں نے مجھے
آتشِ حسن کا مصور بنا ڈالا ہے
ایک لمحے کو سہی دید کی ساعت نے مجھے
اپنے ہی آپ میں مغرور بنا ڈالا ہے
یہ ترا حسن، یہ پیکر، یہ جمالِ رعنا
صرف تجھ پر نہیں صناعِ ازل کا انعام
میرے معبود نے مجھ کو بھی کیا ہے سرشار
تجھ کو دیکھ تو کئی پھول کھلے آنکھوں میں
تو اسی طرح سے شاداب رہے آنکھوں میں

☆☆☆

اس برس کی عید

امسال اس نے مجھ سے مصافحہ نہیں کیا
اس کے لطیف لمس سے محروم انگلیاں
چبھتی ہیں سارے جسم میں
کرتی ہیں شوخیاں!
کہتی ہیں:
"کہئے کیسی رہی عید اس برس
آنکھوں کو رنگ دے نہ سکی
دید اس برس!"
ہاں اس برس کا چاند مسرت نہ بن سکا
دل کا سکون
روح کی راحت نہ بن سکا
وہ صورتِ جمیل
وہ مکھڑا سرور کا
اب بن گیا ہے میرے لئے چاند دور کا
اب وہ شعاعِ لمس بھی بے نور ہوگئی
لیجئے حیات درد سے معمور ہوگئی
اب صبح و شام ہجر کا آکاش دیکھنا
چاروں طرف جدائی کی بو باس دیکھنا

☆☆☆

خدا واپس نہ آئے گا

ہجومِ دردمنداں
رینگتا پھرتا ہے گلیوں میں
کبھی اس در پہ دستک ہے
کبھی اس در پہ آوازیں
چلے آؤ، چلے آؤ
خدا آواز دیتا ہے
خدا کا نام سن کر
چونک پڑتی ہے پرستاروں کی ٹولی
اپنے اپنے کلبۂ تاریک سے
سارے لپکتے ہیں
کسی کے ہاتھ میں پھولوں کی مالا ہے
کوئی حمد و ثنا کرتا ہے
کوئی سر جھکاتا ہے
خدا اپنی سواری پر
تجلی مسکراہٹ سے

انوکھی جگمگاہٹ سے
انہیں دلشاد کرتا ہے
کسی سے پھول لیتا ہے
کسی سے پیار پاتا ہے
پرستاروں کی ٹولی
ٹوٹی پڑتی ہے
لپکتی دوڑتی ہے
اپنی فریادیں اٹھائے
اپنے سینوں میں ہزاروں دکھ چھپائے
خدا سن لے، خدا رک جائے
تو یہ سارے دکھڑے ختم ہو جائے
نہ ہونٹوں پہ فغاں کوندے
نہ سینے بھسم ہو جائے
مگر انبوہِ بے چہرہ میں وہ ہرگز نہ ٹھہرے گا
ثنا خوانوں
طلب گاروں کو
بس مسکان ہی دے گا
ہلاتا جائے گا ہاتھوں کو
آگے بڑھتا جائے گا
خدا مظلوم بستی میں

پلٹ کے پھر نہ آسے گا
قبیلے مختلف ہیں
مختلف سب کے خدا ہیں!

☆☆☆

انٹرویو

میں بھی حاضر تھا وہاں پر
سب مداری
اپنی اپنی آستینوں کو سجائے
صف بہ صف بیٹھے ہوئے ہیں
جھل ملاتے،
چم چماتے،
چکنے چکنے جسم والے
سانپ جیسی جیبھ کو منہ سے نکالے
میری جانب تک رہے ہیں
ایک نے پھنکار ماری
دوسرے نے پھن اٹھایا
تیسرا آسن سے پھسلا
اور چوتھا
اپنی کنڈلی کو رمائے
شیو جی کے جاپ میں کھویا رہا

میں ڈرا سہما ہوا بیٹھا رہا
ناگہاں مجھ پر نکیلے پتھروں کی
پے بہ پے بوچھاریں ہونے لگی
میرا سر کچلا پڑا تھا
رنگ برنگے سانپ
مجھ پر ہنس رہے تھے!

ہندوستاں

وہ عورت مر گئی ہے
جس کو ہندوستان کہتے تھے
تو کیا اعلان کر دوں
مر گیا ہندوستان میرا
تو کیا سچ مچ
ہر ایک اہلِ وطن ہے نوحہ خواں میرا
یقین کر لوں کہ اب دشمن نہیں
کوئی یہاں میرا
وہ عورت مر گئی ہے
جس کو ہندوستان کہتے تھے

☆☆☆

موت

بس اسے کوئی بہانہ چاہئے
چاہے پھر تقریب ہو
تنہائی ہو
سانس لینے کی گھڑی بھر کے لئے فرصت نہ ہو
یا فراغت ہی فراغت آدمی کے پاس ہو
انتشارِ ذات ہو
یا خلفشارِ کائنات
روح کی تسکیں کے ساماں ہوں
یا اسباب نشاط
تندرستی ہو یا بیماری رہے
ہر طرح کا عیش ہو
راحت یا لاچاری رہے
آدمی چاہے بھکاری ہو یا کوئی بادشاہ
کوہساروں میں جئے
یا جنگل و بن میں رہے

کوئی ویرانہ بسائے
یا بڑے شہروں میں کنجِ عافیت تعمیر کرے
مرتبے، منصب، وجاہت
شکل وصورت، حیثیت
کم دہ، غبی یا ذہانت
ذات، مذہب
رنگ ونسل وقومیت
وہ کسی بھی چیز کو گنتی نہیں
اس کی آمد کا معین وقت ہے
پھر کسی صورت سے وہ ٹلتی نہیں
بس اسے کوئی بہانہ چاہیے

☆☆☆

رنگ اڑے

رنگ اڑے ہولی کے بابا
رنگ اڑے ہولی کے

پیارے پیارے، نیارے نیارے
مست، دلارے، چمکیلی ٹولی کے
رنگ اڑے ہولی کے!

بیرن پروائی نے پہلے نخرہ خوب دکھایا
پریم سندیسہ روکے رکھ دیا کل من ترسایا
انگ انگ میں برچھا گھونپا سیروں لہو رلایا
گھڑ و بھلا کیسے بھولیں گے اس چنچل بھولی کے
رنگ اڑے ہولی کے!

آخر ہرجائی نے اپنے مون برت کو توڑا
نیل کنٹھ کو کشٹ دیا اور پیار کا امرت چھوڑا
بھان متی نے پھر جلدی سے اپنا کنبہ جوڑا
مستوں کی ٹولی لہرائی بند کھلے چولی کے
رنگ اڑے ہولی کے!

بھان متی نے راج سنگھاسن کی آشا کب ہے چھوڑی
بجھتے ہردے بھیتر اب بھی جان بچی تھی تھوڑی
کیا جانے کب مہرباں ہو جائے یہ ہوا نگوڑی
یوں بھی تو انداز بدلتے رہتے ہیں بولی کے
رنگ اڑے ہولی کے!

☆☆☆

مجبوری

یہ کیسی منزل مقصود ہے
حیران ہوں!
چندھیائی آنکھوں سے مناظر دیکھتا ہوں
وہ مناظر
جو مرے ہی خون سے رنگیں ہو رہے ہیں
مری تاریخ
تہذیب و ثقافت
ریزہ، ریزہ
گریاں، گریاں
میں پریشاں!
مرے چاروں طرف
چمگادڑوں کا غول پراں
بہت سی کالی بھیڑیں
منہ اٹھائے
افتاں، خیزاں!

سوچتا ہوں

پائے رفتن ہے نہ کوئی جائے ماندن

کیا کروں، کس کو پکاروں

تو کیا پھر سے اسی کا ہاتھ تھاموں

پھر وہی قاتل نہاروں

☆☆☆

فلرٹ

اجی بس شکریہ اب آپ تو شرمندہ کرتی ہیں
جی ہاں، جی ہاں یقیناً آپ مجھ سے پیار کرتی ہیں
نہیں تو کس کو فرصت فلم میرے ساتھ دیکھے
میرے پہلو میں اور مرے پیروں میں اپنے پیر ڈالے
ختم ہو پکچر تو کافی ہاؤس میں کافی پلائے
جی لبھائے،
واپسی میں،
سائیکل پر سامنے،
میرے بانہوں کے حلقے میں اتر آئے
شگفتہ گفتگو سے میرے دل میں تازگی بھر دے
ٹھکتی زندگی بھر دے
یقیناً آپ مجھ سے پیار کرتی ہیں

☆☆☆

خوشبو کا جھونکا

ہوا کے دوش پر خوشبو کا جھونکا
چمن سے جانب صحرا چلا تھا
بزعم دلبری و دلنوازی
کھڑے تھے راہ میں رنگوں کے جنگل
مسافر پیچھے مڑ کر دیکھ لیں تو
گنوا دیں جسم اپنا جان اپنی
وہ پاگل نرم سی خوشبو کا جھونکا
فضا کے زہر میں شامل ہوا ہے
وہی مقتول اب قاتل ہوا ہے

☆☆☆

ادھورا وسیلہ

تو پھر اس نے اپنی کلائی
بڑی ہی نزاکت سے اور شرم سے
میرے ہاتھوں میں دے دی
کہ میں اس کلائی کو مدھ ملتی رنگ کی چوڑیوں سے سجا دوں
مگر میرے دل میں تو ایک چور تھا
میں نے اس مخملیں ہاتھ کو
دیر تک اپنے ہاتھوں میں جکڑے رکھا
انگلیوں کی زباں نے اسے
لمس کی نرم اور گرم سی میٹھی لذت چکھا دی
وہ جب اس نئے ذائقہ کی
شرابی لطافت سے محظوظ ہونے لگی
تو میں نے
شرارت سے اس ہاتھ کو اس طرح چھوڑا
جیسے میرے دل میں
عصیاں کی خواہش نہیں تھی

ایک ہفتہ نہ گزرا کہ میں نے اسے
سات رنگوں کی
ایک خوبصورت سی ساری میں ملبوس دیکھا
وہ یاقوت لب مسکراتی کھڑی تھی
غزالی سی آنکھوں میں سرمہ بھرا تھا
کہ جانے
کسی پیلی خواہش کی کالی چمک تھی
جو دل کو ٹٹولا
تو اک بے سبب زرد خواہش
یہاں گنگناتی پڑی تھی
وہ یاقوت لب مسکراتی کھڑی تھی
بٹھایا اسے
اور اخلاق کے کاغذی پھول چھیڑ کے
اور پھر دیر تک
وہ سماعت کی لذت اٹھاتی رہی
کچھ نہ منہ سے کہا
بس لجاتی رہی
کچھ نئی چوڑیاں دیکھ کر
نرم و نازک کلائی مرے ہاتھ میں سونپ کر
میٹھی مسکان کے
دھیمے دھیمے چراغوں کی لو میں

وہ جانے کہاں کھو گئی
دن گزرتے رہے وقت بہتا رہا
کوئی بے رحم طوفاں اسے بھی
اچانک بہا لے گیا
اور میں
ریت سے مٹھیاں اپنی بھرتا رہا
روز جیتا رہا روز مرتا رہا
دل اکیلا ہی تھا دل اکیلا رہا
آج دو سال گزرے
سنا ہے وہ آئی ہے
تنہا نہیں
ساتھ میں ایک ننھا سا خوش شکل بچہ بھی لے آئی ہے
اور میں سوچتا ہوں
خدا نہ کرے وہ اگر اس جگہ آئے
اور اس کا بچہ
مجھے ماموں کہہ کر پکارے
تو اس بے سبب پہلی خواہش کا کیا ہوگا
جو اکثر مری اور اس کی
ملاقات کا ایک وسیلہ رہی ہے

☆☆☆

کہیں ایسا نہ ہو

پرائی لڑکیوں سے
چندحاتی ملن میں
کتنا کھو جاتا ہوں
جب سوچتا ہوں
میری بیوی......؟ (جو بھی لڑکی ہوگی)
میرے پیار سے سرشار ہوگی
وہ میرے موہ کا ادھار ہوگی
کہیں اس کے بدن میں ڈوب کر
اپنا پتہ بھی نہ بھلا دوں
میں اپنے بھائی بہنوں کی محبت
ماں کی چاہت
باپ کی قربانیاں
سب کچھ مٹا دوں
کہیں ایسا نہ ہو
اک لمس پا کر
میں اپنی زرفشں دنیا نہ دوں

☆☆☆

شامِ گراں

آج کی شام کیسے اچانک سہانی ہوئی
پھراسی سادگی سے
شمیمِ معطر چلی آئی ہے
جس کی خوشبو سے صحنِ رقیباں بسے
جس کی آہٹ سے دیوارِ زنداں پھٹے
جس کے احساس سے موجِ خوں کو روانی ملے
تارِ انفاس کو ایک کھنکتی نشانی ملے
برگِ پژمردۂ جسم و جاں کو جوانی ملے
وہ شمیمِ معطر
اسی زعفرانی شرارے میں ملبوس
پھر آج میری گلی آئی ہے
آج کی شام ایسے اچانک سہانی ہوئی
تیسرے سال میرے خدا کی عجب مہربانی ہوئی
اس کے آنے سے باتوں کا جادو گیا
دست و پا سے سنبھلنے کا قابو گیا

لڑکھڑائی زباں، پینترے سب غلط ہو گئے
اس نے دہلیز پر پاؤں رکھا تو ہم
جیسے مستِ الست ہو گئے
اوڑھنی اس کے شانے سے سرکی
تو جیسے مرے ہر طرف
پیالۂ گل مہر کی پتیاں بچھ گئیں
کیا ہوا
کیا فضا
کیا زمیں، آسماں
دور تک، ہر طرف
زعفرانی دھند لکے ہویدا ہوئے
اور میں ان دھند لکوں میں
اجڑی محبت کا نوحہ
سناتے ہوئے پھر رہا ہوں
اس کے مدھم سروں میں نکلتی ہوئی
میٹھی میٹھی شگفتہ سی آواز نے
مجھ کو چونکا دیا
زعفرانی دھند لکے کے جادو نگر سے نکل کر
میں پھرے، تو خاک پر آ گیا
میری بجھتی ہوئی
سرد سی
جاں بہ لب
شمعِ انفاس کو ایک شعلہ دیا

مجھ کو زندہ کیا

میں نے پوچھا

"طبیعت.......؟"

تو کہنے لگے

"ہے دعا آپ کی"

اس کی چنچل سہیلی نے کہنی لگائی

اور چپکے سے کانوں میں کچھ کہہ دیا

جانے کیا کہہ دیا

اس کے یاقوت جیسے لبوں پر ہنسی کھل گئی

میرا احساس زندہ ہوا

اور ایک پل میں دنیا نئی ہو گئی

دیر تک شبنمی گفتگو

ریشمی قہقہے

اپنے محور پہ جیسے زمیں رک گئی

آسماں جیسے انعام دینے لگا

بھولی بسری غزل یاد آنے لگی

"رنگ ہر زعفرانی لگے ہے مجھے

شام کتنی سہانی لگے ہے مجھے

تو کہاں آ گئی خواب کی اپسرا

نیند میں زندگانی لگے ہے مجھے

یہ ملن تجھ سے اتنا تو آساں نہ تھا

اک طلسمی کہانی لگے ہے مجھے"

میں ابھی اس طلسمی کہانی میں کھویا ہوا تھا

کہ امی

کسی روتے بچے کو کمرے میں لا کر یہ کہنے لگیں

"شمی بیٹی..... !

سنبھالو اسے

یہ بڑی دیر سے رو رہا ہے

چلو دودھ دے کر ذرا چپ کرا دو اسے"

اس نے بچے کو آغوش میں ڈال کر

مجھ کو دیکھا تو ایسا لگا

اس کی آنکھوں میں ممتا ہے اور کچھ نہیں

میں نے سوچا

جسے چھو سکوں ایسا پیکر مجھے بھی دکھائی تو دے

روح میں جو اتر جائے

آواز ایسی سنائی تو دے

کیوں صدائے ہوس پر طبیعت دیوانی ہوئی

آج کی شام کیسے سہانی ہوئی..........؟

☆☆☆

ایک پریشاں شامِ آزادی

اچانک نجانے اسے کیا ہوا
وہ مچلنے لگا
اس کی ضد تھی کہ جادو کی دنیا دکھ دوں اسے
روز دادی سے سنتا ہے جس کی کہانی
وہ سونے کی چڑیا دلا دوں اسے
طفلِ معصوم کی ضد تھی
کب تک ستاتا اسے
ٹافیاں لے کے دیں
شہر کی سیر کروائی
ہر طرح اس کو مناتا رہا
اس کی سنتا رہا
ناز اٹھاتا رہا
گھر کو لوٹے تو پھر اس کی ضد تھی وہی
میں پریشان ہوں

اے خدا کیا کروں

میں تو خود ایک مدت سے اس کے لئے سرگرداں ہوں

نجانے وہ سونے کی چڑیا کہاں اڑ گئی

نجانے وہ جادو کی دنیا کہاں کھو گئی

☆☆☆

واپسی

جب میں ان گلیوں میں داخل ہو رہا تھا
رات بوڑھی ہو چکی تھی
راستے کے دونوں جانب برقی شمعیں رو رہی تھیں
شہر کسی بے بصر سادھو کی صورت چپ کھڑا تھا
انگشت بجھتی ہوئی آنکھوں کا نوحہ گر

.........نیلمبر سو رہا تھا
جانے کیا افتاد تھی مجھ پر مرا دل رو رہا تھا
پاؤں سے لپٹی ہوئی مٹی کو ہاتھوں میں اٹھا کر
سونگھ کر دیکھا
وہی خوشبو، وہی ممتا
وہی چاہت رچی تھی
وہ مٹی آج بھی کتنی بھلی تھی
اچانک ایک ملائم سرد جھونکا مجھ سے ٹکرایا
مری پیشانی کے بوسے لئے
آنکھوں میں جھانکا

دل میں اترا
اور موجِ خوں میں ہرایا
میں اس مٹی سے
اس ٹھنڈی ہوا سے
روٹھ کر
کتنا پریشاں تھا، ہراساں تھا
اسے سوچ تو شرمایا
مری شرمندگی کو دیکھ کر
پورب دشا سے اوشارانی
ایک تھالی میں سنہرا پھول لے آئی
کہ میں زرتار کرنوں میں نہالوں
پھر نیا ہو لوں
پھر اس مٹی کو چوموں
اور
ہوا کا پیرہن چھولوں

☆☆☆

آموختہ

پھر انہیں بھول کر مدتیں ہو گئیں
یوں لگا
جیسے بیتے دنوں کی کوئی شام زندہ نہیں
میری آنکھوں میں چاہت کے پیغام زندہ نہیں
بجھ گیا دل
وہ خورشید چہرے دھواں ہو گئے
سر پٹکتی، تڑپتی فغاں ہو گئے
مجھ پہ گزرے ہوئے سانحے داستاں ہو گئے
جب بھلا کر انہیں مدتیں ہو گئیں
زندگی سوئی کی نوک پر جا ٹکی
پھر کسی زخم کا یا کسی درد کا کوئی احساس جاگا نہیں
جیسے سینے میں دل کی جگہ دل نہیں
کوئی جذبہ نہیں
جتنے جذبات تھے رائگاں ہی گئے
چند لمحات جی کا زیاں ہو گئے

عمر کے بے جہت جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے کارواں ہو گئے

یہ سنا تھا
کسی نے ہواؤں کو دیکھا نہیں ہے
چھوا بھی نہیں
ہوا صرف محسوس ہوتی ہے
ہاتھوں میں آتی نہیں
آج کی زندگی بھی ہوا ہو گئی
زندگی کو کہیں ہم نے دیکھا نہیں
چھوا بھی نہیں
یہ ہمیں بھولے سے محسوس ہوتی نہیں
سب ہواؤں کے سیلاب میں بہہ گئے
وہ کہاں کھو گئے
ہم کہاں رہ گئے
......اب انہیں بھول کر مدتیں ہو گئیں

☆☆☆

پیاسا

سرِ ساحل ہے اس کا خیمہ
جب بھی چاہتا ہے
ٹھنڈے میٹھے پانیوں میں دیر تک
غوطے لگاتا ہے
کبھی ہاتھوں میں بھر لیتا ہے پانی وہ
کبھی ساحل کی سوکھی ریت پر
چھینٹے اڑاتا ہے
سلگتی دھوپ میں
تپتے ہوئے بے نام ذروں کو
چبھتی تشنگی سے لطف لے کر
ٹھنڈے میٹھے پانیوں میں
پھر سے
ایک غوطہ لگاتا ہے
منزہ جسم کو ملتا ہے ہاتھوں سے
وہ زیرِ ناف بالوں میں کبھی انگلی پھراتا ہے

نکل کر پانیوں سے
مخملیں خیمے کے اندر
خوبصورت گاؤ تکیے پر
لٹا دیتا ہے خود کو
اور پھر
لوح و قلم ہاتھوں میں لے کر
شعر لکھتا ہے
کہ میں صدیوں سے پیاسا ہوں
نجانے پیاس میری کب بجھے گی

☆☆☆

دنوں بعد

چلو اس بھری رہ گزر سے
ذرا دور ہٹ کر
کنارے سے ہو لیں
دنوں میں دکھائی دیے ہو
کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
آؤ رو لیں

سناؤ.......
تمہارے 'وہ' کیسے ہیں
کس طرح کٹتی ہیں شامیں سہانی

سنا ہے
کہ رہنے لگی ہو نئے ننھے منے میں اتنی دیوانی
کہ بیتے دنوں کی
کوئی یاد بھی تم کو چھوتی نہیں ہے
وہ لڑکی،
جو پہلے بھی مغرور تھی

اب بھی ٹوٹی نہیں ہے
ارے.........!
ارے مسکرانے لگی ہو تو پلکوں پہ یہ کیسی نمی ہے
تو کیا.......؟
تو کیا پریمیکا اب بھی زندہ بچی ہے

☆☆☆

من چاہا عذاب

اچھا......!
تو پھر آپ مشکل کشائی کو تشریف
لائے ہیں
فرمایئے......؟
اب بھی ہاتھوں میں تارے وہی ہیں
نظارے وہی ہیں
سہارے وہی ہیں
یا اس بار کچھ اور سوغات ہے
دوسری بات ہے
کچھ نئی رات ہے
رات کے واسطے محفلِ شمع بھی
ہم نوا جمع بھی
ہم نواؤں کا اس سال کیا بھاؤ ہے
اب بھی افراط ہے اہلِ دل کی
یا ٹوٹا ؤ ہے

خیر، آجایئے
اس برس بھی تو عوام جاگے نہیں
وہ ابھاگے نہیں
چند مستوں کو عورت،
کسی کو شراب
اور کسی کو کھنکتی کرنسی کی جھنکار کافی رہے گی
آپ کی زرد مشکل کشائی
ابھی اور کچھ روز باقی رہے گی

☆☆☆

بازگشت

ہر طرف بس یہی ایک آواز ہے
ساتھ ٹوٹے نہیں
ہاتھ چھوٹے نہیں
ہم نوائی کرو
اس کو مضبوط ہاتھوں سے تھامے رہو
اور جب درگہِ عالیہ میں رسائی ملے
آنکھ نیچی رکھو
ہاتھ باندھے رہو
شکریں لب بھی ہے، شیریں گفتار بھی
اس کے ابرو ہے کلیاں بھی
تلوار بھی
اس کی آنکھوں کے جیسا نہیں
دوسرا کوئی عیار بھی!
مسکرائے تو سمجھو وبا آ گئی
کتنا خوں پی گئی

کتنے گھر کھا گئی

دیکھتے دیکھتے ہی زمیں آگ اگلنے لگی

پوتھی پوتھی وشیلی فضاؤں میں

الفاظ جلنے لگے

آپ ہم دور سے سخت حیران ہیں

جانے کیا بھید ہے

جانے کیا راز ہے

ہر طرف بس یہی ایک آواز ہے

☆☆☆

کیسا منظر ہے؟

آؤ......سب آؤ........دیکھیں ادھر........
اس طرف
کیسا منظر ہے
آکاش پر
دور تک خون پھیلا ہوا ہے
شعاعیں کسی بحرِ ظلمات میں غرق ہونے لگیں
زندگی سے رچی زندگی بخش کرنیں بھی کھونے لگی
بے تحاشہ سیاہی کی یلغار میں
مجھ میں یہ کون ہے جو بکھرنے لگا
ایک چھدری ہوئی لاش آہستہ آہستہ بہنے لگی
دھیرے دھیرے اندھیرا ابھرنے لگا
کالے تیروں کی بوچھار میں
آؤ ......سب آؤ........دیکھیں ادھر..... .. .
اس طرف کیسا منظر ہے
دور تک ساری دھرتی پہ
یہ سرخ دھبے
کہاں سے ابھر آئے ہیں؟

☆☆☆

جوئے شیر

اچانک کیسے جوئے شیر پھوٹی؟
ہزاروں کیس تو یونہی پڑے تھے
ہزاروں مسئلے یونہی پڑے تھے
ہزاروں فائلیں بوسیدہ ہو کر
وظیفہ یاب منصف ہستیوں کو
خراجِ داد و تحسیں دے چکی ہیں
کہیں سے نہ کوئی تنویر پھوٹی
اچانک کیسے جوئے شیر پھوٹی؟

وہ کیا عورت تھی جس نے عورتوں کو
برہنہ بھی کیا، بے آبرو بھی
ذلیل و خوار بھی
رسوا سرِ بازار بھی
متاعِ جاں بھی لوٹی، آرزو بھی
خبر تو بن گئی ہر بات لیکن
کہیں احساس کی تحریر پھوٹی
اچانک کیسے جوئے شیر پھوٹی؟

مبارک باد اس عورت کو، جس نے
عدالت کو نمایاں کر دیا ہے
حکومت کو پشیماں کر دیا ہے
سیاست کو پریشاں کر دیا ہے
فسادی فتنہ پرور سخت حیراں
گریباں چاک ہیں، نالہ کناں ہیں
یہ کیسی صورتِ تحقیر پھوٹی؟
اچانک کیسے جوئے شیر پھوٹی؟

مبارک باد اس عورت کو، جس نے
بلا خوف و خطر ثابت کیا ہے
کہ عورت نام ہے انسانیت کا
کہ عورت نام ہے اک حوصلے کا
یہ عورت افتخارِ عدلیہ ہے
یہی عورت وقارِ عدلیہ ہے
اسی عورت کی مردانہ روی سے

کئی مردوں کی ہے نکسیر پھوٹی!
اچانک کیسے جوئے شیر پھوٹی؟

☆☆☆

بوڑھا دسمبر

نحیف و ناتواں بوڑھا دسمبر
ہزاروں بوجھ لادے جا رہا ہے
اجالے کھو گئے تاریکیوں میں
پشیمانی سے اپنا سر جھکائے
بڑا مایوس ہے
چپ چاپ سا ہے
نہ آنکھوں میں کوئی امید روشن
نہ چہرے پر خوشی کی لہر کوئی
تھکن سے چور اس کے ہاتھ پاؤں
اب اس کے شہر باقی ہے نہ گاؤں
بہت کی سال بھر تک حکمرانی
مگر کب تک رہے گی لن ترانی
نیا سورج اگا ہے جنوری کا
اجالا پھیلتا ہے زندگی کا
سنو بوڑھے دسمبر کی صدائیں
اجالے تیرگی میں کھو نہ جائیں

☆☆☆

PARINDE TO MUSAFIR HAIN

(Abdul Raheem Nshtar Ki Nazmon Ka Intekhab

Edit by

Prof. Mohd Danish Gani

عبدالرحیم نشتر روز اول ہی سے ایک احتجاجی شخصیت کے حامل رہے ہیں ۔ شاعری میں بھی اور شاعری کے علاوہ بھی لیکن ان کا یہ احتجاج کسی بلیک میلنگ کے تحت نہیں تھا بلکہ وہ سماجی نابرابری اور تعلیمی اداروں کی ناقدر شناسی کے خلاف ایک جہاد تھا، جہاں صلاحیتوں کو روند کر بے صلاحیت سروں پر تاج رکھ دیے جاتے ہیں

لیکن جیت بہر حال سچائی کی ہوتی ہے ۔ ایک دن سارے باطل حیلے حوالے اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں ۔ نشتر کے فکری اور فنی احتجاج نے یہی کر دکھایا کہ انصاف کو سربلند کر دیا اور خود بھی سرخ رو ہوئے لیکن انھوں نے اس وقت جو کچھ اپنی شاعری میں نچوڑا تھا وہ شاعری میں موجود رہا اور اب یہ نظمیں عزیزی دانش غنی مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں ۔ ان نظموں کے فکری نظام اور فنی زاویوں پر اظہار خیال کافی ہو چکا ہے البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اپنی سچائیوں کے برجستہ اظہار کے سبب یہ نظمیں آج بھی تازہ ہیں ۔

دانش غنی نے واقعی اپنی دانش مندی کا ثبوت دیا کہ اپنے والد کے بکھرے اثاثے کو اشاعتی دھاگے میں پرو کر کتاب کی صورت میں محفوظ کر دیا ۔ اب یہ نظمیں جہاں جہاں بھی پڑھی جائیں گی اپنے ماضی کے احتجاجی رویوں کا بھی اعادہ کریں گی ۔

نذیر فتح پوری

Publisher

Asbaque Publications

[illegible] Sanjay Park,
Lohegaon Road, Pune [illegible] M.S. (India)
M. [illegible]
E-mail: [illegible]@yahoo.com

978-93-80395-27-2